ولكنكم تستعجلون

تاریخِ ایمان کا اہم ایک سبق

شيخ ابو قتاده فلسطيني حفظه الله

اردو ترجمہ: شرح حدیث خباب بن ارت رضی اللہ عنہ

ادارہ السحاب، برِّصغیر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ رب العٰلمین۔والصلاۃ والسلام علی ا لنبی الامین۔وعلی اٰلہ

واصحابہ اجمعین۔ اما بعد

سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے" کہ ہر آفت و مصیبت کی ایک انتہاء ہوتی ہے،جب بھی کسی پر کوئی مصیبت آتی ہے تو ایک نا ایک دن (وقت آنے پر) ضرور ختم ہوتی ہے۔چنانچہ عقل مند انسان کو چاہیے کہ جب اس پر کوئی مصیبت آئے تو پامردی و تحمل کے ساتھ اسے برداشت کرے،اس پر صبر کرے جب تک کہ اس مصیبت کے ختم ہونے کا وقت جو اللہ کے ہاں مقرر ہے نہیں آجاتا،کیونکہ یہ مصیبت اس وقت سے قبل ٹل تو نہیں سکتی لہذا اگر یہ اس پر یوں ہی واویلا شروع کر دے تو اپنے لیے پریشانی اور تنگی میں اضافے کا سبب یہ خود بن رہا ہے۔"

عظیم الشان نبوی دعوت علی صاحبہا الصلاۃ والسلام،۱۳ سال تک ایک ہی جگہ پر انتہائی نامساعد حالات میں تھوڑی بہت ظاہری کامیابی کے ساتھ مکہ ہی تک منحصر رہی،اس عرصے میں چند ہی لوگ ایمان لائے،اور پھر یہ مؤمنین بھی کچھ ہی عرصے بعد اپنے معاشرے سے کٹ کر ایک ایسی جگہ (حبشہ) کی طرف ہجرت کر جاتے ہیں کہ جہاں صرف دشمن سے اپنی جان کی حفاظت کے سوا بظاہر اور کوئی نفع نہیں! اور جو تھوڑے بہت لوگ ایمان لائے وہ بھی بعثتِ نبوت کے بالکل ابتدائی سالوں ہی مسلمان ہوئے ، بعد کے سالوں میں کوئی اِکادُکا ہی ہی دائرہ اسلام میں داخل ہوا۔اگر آپ اس عرصے کا بغور مطالعہ کریں کہ جس میں تھوڑی سی ظاہری کامیابی کے سوا کچھ نہیں!تو آپ کو احساس ہو گا کہ دراصل 'دعوتوں" تحریکوں' کی اصل عمر یہی ہوتی ہے، کہ جس میں کسی علاقے پر قبضہ اور کسی طرح کی فتح نہیں ہوتی بلکہ وہ محض اپنا دفاع ہی کر پاتی ہیں!

اور پھر مکی دعوت کا عرصہ اس مدنی عرصہ سے زیادہ ہے جس میں فتح ہے،نصرت ہے دین کی دعوت کا چہار سو پھیلاؤ ، اور لوگوں کا فوج در فوج اسلام کے حلقہ بگوش ہونا ہے!ایسا کیوں ؟ اور اس میں ایسی کون سی ربانی

حکمت پوشیدہ ہے؟تو سنیے! جواب حاضر ہے! جواب دینے والے کہتے ہیں کہ مکی دَور در حقیقت تربیت کا دَور ہے! یہ بالکل بجا ہے لیکن تربیت کی تشریح ووضاحت ہر کسی نے اپنے ذوق اور پسند کے مطابق مختلف کی ہے، جبکہ در حقیقت اس کا صرف اور صرف ایک ہی مطلب ہے، اور وہ ہے آزمائشوں پر صبر کی تربیت!اور تنگی کے بعد آسانی کے ربانی وعدے کے پورا ہونے کا انتظار!

یہ مکی دور پے در پے مشکلات کا زمانہ ہے،روز بہ روز آزمائشیں بڑھتی ہی جاتی ہیں!جب کہ ان سے مقابلے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے۔صبر!!

مکہ میں مصائب جھیلنے والوں کا حال بالکل اس قیدی کی طرح تھا کہ جس پر جیل میں روز بہ روز تشدد اور دباؤ میں اضافہ ہی ہوتا چلا جارہا ہو، لیکن اس کا یقین ہے کہ ایک دن ضرور یہ آزمائش اپنی انتہاء کو پہنچے گی، جیل کے دروازے اس پر کھل جائیں گے اور وہ ایک ایسی دنیا دیکھے گا جو اس جیل کی دنیا سے یکسر مختلف ہوگی، وہ اس جیل اور جیلر کے سلوک کا مقابلہ صرف صبر وثبات اور آسانی وفراخی کے وعدے کے پورا ہونے کے بھرپور یقین سے کرتا ہے،

قیدی کے حق میں دشمن کے جبر وتشدد اور ظلم کے تحت ایمانی اقدار پر قائم رہتے ہوئے صبر کی آزمائش کو جھیلنا اس کی تربیت کا لازمی حصہ ہے۔یہ تربیت ہی اسے اس قابل بناتی ہے کہ وہ جیل سے رہائی پانے کے بعد اپنے دشمن سے مقابلہ کرسکے۔ سختی وتنگی کا یہ زمانہ ملکوں اور تہذیبوں کے اکثر بانیوں پر گذرا ہے۔یہ زمانہ آپ کے اور آپ کے دشمن کے درمیان جنگ کے حقیقی سبب وصورت حال کو واضح کرنے کے لیے انتہائی ضروری ہے۔اسی سے آپ کے اور آپ کے دشمن کے دین میں فرق واضح ہوتا ہے۔ سختی اور تنگی کا یہ زمانہ گذارنے کے بعد آپ اپنے دشمن کے خلاف جو اقدام اٹھائیں گے وہ وہ تاریخ ساز، واضح اور بیّن ہوگا۔

۱۳ سال تک قریش نے اسلام اور اہل اسلام کے ساتھ اپنا رویہ انتہائی تند وتیز رکھا، کیونکہ اس دعوت کو روکنے کے لیے ان کے پاس ہر طرح کے مواقع تھے،جب کہ اہل اسلام کے پاس قریش کے اس تعامل کا

صرف ایک ہی حل تھا' صبر اور ثابت قدمی، جو انہوں نے آسمانی ہدایت (قرآن پاک) سے سابقہ انبیاء کے واقعات کو پڑھ کر سیکھا تھا، اور اہل اسلام کو بھی بعینہ ان ہی حالات و واقعات کا سامنا تھا۔

پس ایک طرف تو یہ ابتلاء و آزمائشوں کو سہنے کی تربیت ہے کہ ' جس کے نتیجے میں' اللہ کے وعدوں کی تکمیل کا مکمل یقین حاصل ہوتا ہے۔ جبکہ دوسری جانب ان سخت مراحل سے گذر کر ہی ایک مومن کے سامنے اپنے دشمن کی حقیقی صورت واضح ہو جاتی ہے، اور اس بات کا صحیح اندازہ ہوتا ہے کہ کفر' اس دعوت کی کامیابی کے ربانی وعدے ' کو پورا ہونے سے روکنے کے لیے اپنی پوری قوت وجبروت کے ساتھ اس کے مقابلے کو تیار ہے۔

کسی بھی کام کے لیے انسان کو ذہنی ' و جسمانی' طور پر آمادہ (تیار) ہونے کے لیے کافی وقت درکار ہوتا ہے، شاید اسی وجہ سے دوسری مخلوقات کی نسبت انسان کی پیدائش سے لے کر اس کے چلنے تک کا وقفہ نسبتاً طویل ہے، کیونکہ دیگر مخلوقات میں سے اکثر پیدا ہوتے ہی چلنا شروع کر دیتے ہیں۔ لیکن افکار و اعتقادات کے معاملے میں انسان اس قاعدے سے مستثنیٰ ہے، کیونکہ ایمان جیسے ہی دل میں آتا ہے آتے ساتھ ہی دل میں اپنی جڑیں مظبوط کرلیتا ہے، اس کو دل میں راسخ کرنے کے لیے زمانے درکار نہیں ہوتے، جیسا کہ اس دور کے بعض مرشدوں، مربیوں کا خیال ہے۔ دیکھیے کے فرعون کے جادوگروں نے آن کی آن مین کفر سے ایمان اور پھر ایمان کی گواہی تک کا مرحلہ طے کر لیا!!۔ تاریخ میں اس کی اور بھی بہت سی مثالیں ہیں! لیکن (صریح) ایمان اور (صریح) کفر کے درمیان کی جو حالت ہے اسے واضح کرنے کے لیے مختلف حوادث و واقعات سے اور ایک طویل مدت سے گذرنا ضروری ہوتا ہے تاکہ بیچ کی صورت ختم ہو کر کوئی ایک جانب واضح ہو جائے۔ اسی طرح دعوتوں اور تحریکوں کا لمبے وقت کی بھٹی سے گذرنا اس لیے بھی ضروری ہے تاکہ دو متحارب گروہوں کے درمیان جنگ یا صلح میں سے کسی ایک کا حتمی تعین کیا جاسکے۔ پس اگر تو یہ مقصد مختلف حادثات اور وقت کی بھٹی سے گذرنے کے بعد حاصل ہو جائے تو یہ آنے والے مستقبل کے لیے مشعلِ راہ اور گراں قدر سرمایے کی حیثیت رکھتا ہے، جسے بعد میں آنے والوں کی خواہشات اور محض

زبانی کلامی دعووں سے بدلا نہیں جاسکتا۔ اگر آپ قرآن پاک اٹھائیں اس میں موجود مکی دور سے متعلق ایات کا مطالعہ کریں تو یہ چیز آپ کو بہت واضح نظر آئے گی، یعنی کفارِ قریش کی اہلِ ایمان سے دشمنی وعداوت کی صحیح تصویر! آپ جان جائیں گے کہ یہ ایک ایسی قوم ہے کہ جس سے دوستی ومودت کا کوئی بھی تعلق رکھنا روا نہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے: لَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۝ اِنَّمَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ قٰتَلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَاَخْرَجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ وَظٰهَرُوْا عَلٰٓي اِخْرَاجِكُمْ اَنْ تَوَلَّوْهُمْ ۚ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ [الممتحنة:۸،۹]

”جن لوگوں نے تم سے دین کے بارے جنگ نہیں کی اور نہ تم کو تمہارے گھروں سے نکالا ان کے ساتھ بھلائی اور انصاف کا سلوک کرنے سے اللہ تم کو منع نہیں کرتا، بے شک اللہ تو انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ اللہ انہی لوگوں کیساتھ تم کو دوستی کرنے سے منع کرتا ہے جنہوں نے تم سے دین کے بارے میں لڑائی کی اور تم کو تمہارے گھروں سے نکالا۔ اور تمہارے نکالنے میں اوروں کی مدد کی۔ تو جو لوگ ایسوں سے دوستی کریں گے وہی ظالم ہیں“۔

اور اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

اَلَا تُقَاتِلُوْنَ قَوْمًا نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ وَهَمُّوْا بِاِخْرَاجِ الرَّسُوْلِ وَهُمْ بَدَءُوْكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۭ اَتَخْشَوْنَهُمْ ۚ فَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشَوْهُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ [التوبۃ:۱۳]

”بھلا تم ایسے لوگوں سے کیوں نہ لڑو (جنہوں نے اپنی) قسموں کو توڑ ڈالا اور پیغمبر (خدا) صلی اللہ علیہ وسلم کے جلا وطن کرنے کا عزم مصمم کر لیا اور انہوں نے تم سے (عہد شکنی کی) ابتداء کی؟ کیا تم ایسے لوگوں سے ڈرتے ہو؟ حالانکہ اللہ اس بات کا زیادہ حق دار ہے کہ تم اس سے ڈرو بشرطیکہ ایمان رکھتے ہو۔“

پس یہ کئی سالوں پر محیط عرصہ صرف اس لیے مختصر لگتا ہے کہ مستقبل میں فتح و نصرت کے بعد جو ظاہری عمارت بننے والی ہے یہ اس کے لیے تربیت کا سامان ہے۔ کیونکہ یہی اس عمارت کی وہ حقیقی بنیادیں ہیں جو زمین کے اندر تک گڑی ہوئی ہیں۔

اس مرحلے کی اہمیت جاننے سے پہلے یہ بات ذہن نشین کر لیں کہ لازمی نہیں کہ ہر دعوت یا تحریک کی ابتداء ہی میں اسے ان مشکلات سے پالا پڑے۔ بلکہ کبھی شروع میں، کبھی درمیان میں ان حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، غرض جس وقت صلاحیت سازی کی ضرورت پیش آتی ہے تب ہی ان حالات سے گذارا جاتا ہے۔

یہ مرحلہ ہے کیا؟ بظاہر اس میں سوائے انتظار وسکون کے اور کچھ نہیں ہوتا! اسی وجہ سے بہت سے لوگوں کے لیے یہ وقت انتہائی خطرناک ثابت ہوتا ہے۔ وہ پریشانی میں گھلے جاتے ہیں، اپنے ہتھیار ڈال دیتے ہیں اور دھاڑیں مارتے پھرتے ہیں کہ بس! معاملہ ختم! سب کام ٹھپ ہو گیا! تاریخ کا دروازہ ہم پر بند ہو گیا! جہاں سے چلے تھے قافلے واپس وہیں کے وہیں آن پہنچے!

اس ساری آہ وبکا اور ذہنی شکست کا سبب کیا ہے؟ جی ہاں! اس کا سبب ہے تاریخ کا ذہنوں اور نظروں اوجھل ہو جانا! یہ دراصل کم ہمت لوگوں کی نشانی ہے، کہ آزمائشیں جن کے قدم اکھاڑ پھینکتی ہیں۔ ایسے روتے پھرتے ہیں گویا ان کی چھوٹی سی عمر بھی ان سے چھین لی گئی ہے!

جب فضا اس قدر تنگ ہو جائے جیسے ایک قیدی کی زندگی ہوتی ہے، جب آپ کا کام فقط دن شمار کرنا رہ گیا ہو، جیسے نہر کے کنارے بیٹھا کوئی شخص اپنے سامنے سے پانی کو گذرتا دیکھتا رہتا ہے، مزید بر آں آپ کے کندھوں پر ہجرت و اجنبیت کا بوجھ بھی ہو اور دشمن کی طرف سے مشکلات اور سختیاں بھی! اسی طرح دن پر

دن گذرتے چلے جائیں، تو ذہن میں لامحالہ کچھ سوالات ابھرتے ہیں۔ کہ "اب کیا ہو گا؟ یہ سب کیسے ہوا؟ کیا کبھی ایسا بھی ہو گا کہ دنیا مظلوم و مقہور قیدی اور ظالم و جابر کے درمیان عدل کرے؟"

لیکن اس سب سے زیادہ خطرناک حالت وہ ہے کہ جب آپ کے دل میں یہ خیال گردش کرنے لگے کہ اس مشکلات بھری فضا سے چھٹکارا کیسے حاصل کیا جائے؟ اور پھر جواب میں نظر سب سے پہلے ان اسباب کی طرف اٹھے جو ان مشکلات و مصائب کا سبب بنے تھے۔ معاذاللہ

جاہلیت (کفارِ مکہ) نے صاحبِ دعوت ﷺ اور آپ کے متبعین سے چند مطالبات کیے۔ اولاً تو انہوں نے اصلِ دعوت ہی کا انکار کیا، کام نہ بنا تو بعض باتوں کا انکار کیا اور بعض کو ماننے کے لیے تیار ہو گئے، لیکن آپ ﷺ اور صحابہ کے لیے سب سے زیادہ تکلیف دہ بات یہ تھی کہ وہ حجت بازی (دلیل کے ذریعے غلبہ پانے کی کوشش، مترجم) کرنے لگے، گالی گلوچ پر اتر آئے، اہلِ ایمان کی پاکیزہ اقدار و امتیازی اوصاف اور ان کی تاریخ ہی پر کیچڑ اچھالنا شروع کر دیا۔ سب سے پہلے تو ان اصولوں ہی کا انکار کیا جن پر اس دعوت کی بنیاد قائم تھی۔ اللہ تعالی کا ارشاد ہے: وَعَجِبُوٓا اَنۡ جَآءَهُمۡ مُّنۡذِرٌ مِّنۡهُمۡ ۫ وَقَالَ الۡكٰفِرُوۡنَ هٰذَا سٰحِرٌ كَذَّابٌ ۝ اَجَعَلَ الۡاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ اِنَّ هٰذَا لَشَیۡءٌ عُجَابٌ ۝ وَانۡطَلَقَ الۡمَلَاُ مِنۡهُمۡ اَنِ امۡشُوۡا وَاصۡبِرُوۡا عَلٰۤی اٰلِهَتِكُمۡ ۚ اِنَّ هٰذَا لَشَیۡءٌ یُّرَادُ ۝ مَا سَمِعۡنَا بِهٰذَا فِی الۡمِلَّةِ الۡاٰخِرَةِ ۚ اِنۡ هٰذَاۤ اِلَّا اخۡتِلَاقٌ ۝ ءَاُنۡزِلَ عَلَیۡهِ الذِّكۡرُ مِنۡۢ بَیۡنِنَا ؕ بَلۡ هُمۡ فِیۡ شَكٍّ مِّنۡ ذِكۡرِیۡ ۚ بَلۡ لَّمَّا یَذُوۡقُوۡا عَذَابِ ۝ [سورۃ ص: ۸،۷،۶،۵،۴]

"اور انہوں نے تعجب کیا کہ ان کے پاس انہیں میں سے ہدایت کرنے والا آیا اور کافر کہنے لگے کہ یہ تو جادوگر ہے جھوٹا۔ کیا اسنے اتنے معبودوں کی جگہ ایک ہی معبود بنا دیا! یہ تو بڑی عجیب بات ہے۔ تو ان میں جو معزز تھے وہ چل کھڑے ہوئے (اور بولے) کہ چلو اپنے معبودوں (کی پوجا) پر قائم رہو بیشک یہ ایسی بات ہے جس سے (تم پر شرف و فضیلت) مقصود ہے۔ یہ پچھلے مذہب میں ہم نے کبھی سنی ہی نہیں یہ بالکل بنائی ہوئی بات

ہے۔ کیا ہم سب میں سے اسی پر نصیحت (کی کتاب) اتری ہے؟ (نہیں) بلکہ یہ میری نصیحت کی کتاب سے شک میں ہیں بلکہ انہوں نے ابھی میرے عذاب کا مزہ نہیں چکھا۔"

یہ توحید اور رسالت ہی کا کھلا انکار ہے۔ اسی طرح انہوں نے آخرت کا بھی انکار کیا:

قٓ وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ ۝ بَلْ عَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ فَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا شَيْءٌ عَجِيْبٌ ۝ ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا ۚ ذٰلِكَ رَجْعٌۢ بَعِيْدٌ ۝ [ق ۳،۲،۱]

" ق قرآن مجید کی قسم کہ محمد پیغمبر خدا ہے۔ لیکن ان لوگوں نے تعجب کیا کہ ان ہی میں سے ایک ہدایت کرنے والا انکے پاس آیا تو کافر کہنے لگے کہ یہ بات تو (بڑی) عجیب ہے۔ بھلا جب ہم مر گئے اور مٹی ہو گئے (تو پھر زندہ ہونگے؟) یہ زندہ ہونا (عقل سے) بعید ہے"

پھر کوشش کی کہ آپ ﷺ اپنی دعوت اور ان کے عقائد کی رعایت کرتے ہوئے درمیان کا کوئی راستہ ہی اختیار کر لیں۔ اللہ تعالی نے اپنے رسول کو ان کی کسی بھی درجہ میں متابعت سے روکتے ہوئے ارشاد فرمایا:

قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ۝ لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ۝ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ ۝ وَلَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ ۝ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ ۝ لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ ۝ [سورۃ الکافرون]

"(اے پیغمبر، ان کافروں سے) کہہ دو کہ اے کافرو، نہ تو میں تمہارے معبودوں کی عبادت کرتا ہوں۔ اور نہ تم ہی میرے معبود کی عبادت کرتے ہو۔ اور نہ میں تمہارے معبودوں کی عبادت کروں گا۔ اور نہ تم میرے معبود کی عبادت کرو گے تمہارے لئے تمہارا دین ہے اور میرے لئے میرا دین۔"

اس مرحلے میں کفار کا سارا زور اس بات پر تھا کہ اہلِ ایمان کو کسی بھی درجہ میں کوئی ادنی سی کامیابی بھی نہ ملنے پائے! چنانچہ اس وقت اہلِ ایمان کا صبر و ثبات ان کے لیے کفار کی طرف سے ذہنی و جسمانی تکالیف میں مزید اضافے کا سبب تھا۔ اس قدر شدت کے باوجود بھی جب اہلِ ایمان کے عزم و ہمت میں کوئی فرق نہ آیا تو

کفار از خود کچھ تنازل اختیار کرنے پر مجبور ہوئے، یہاں تک کہ ایک وقت آیا کہ جب ان کی کوششوں کی انتہاء یہ تھی کہ 'چلو، جو اب تک اسلام لا چکے سو لا چکے لیکن مزید کوئی نیا آدمی اسلام کے حلقہ بگوش نہ ہونے پائے، یا یہ دعوت و اہلِ دعوت مکہ کی حدود سے باہر نہ جانے پائیں۔ بے شک یہ کمزوری کا زمانہ تھا، کہ جس میں ثابت قدمی کا امتحان مقصود ہوتا ہے۔ کیونکہ اگر کوئی شخص تنگی، شدت اور ضعف کے اس زمانے میں ایمانی اقدار پر قائم نہ رہ سکے تو قوۃ و غلبہ اور فتح و نصرت کے ایام میں اس پر اعتماد کیسے کیا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ کوئی شخص جب تک راحت و آسانی کے انتظار کا کڑوا گھونٹ نا بھر لے تو اسے راحت و آسانی اور فتح و نصرت کی قدر و قیمت اور اہمیت کا احساس کیسے ہو سکتا ہے۔

یہی اصل امتحان کا وقت ہوتا ہے۔ اسی عرصے میں مستقبل میں درکار صلاحیتوں کی عالمِ غیب میں تشکیل ہوتی ہے، بالکل ایسی جیسے ماں کے پیٹ میں بچے کی شکل و صورت تشکیل پاتی ہے۔ چنانچہ اس بچے کی مکمل نشو و نما کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنا مناسب فطری وقت پورا ہونے پر ہی اس دنیا میں آئے۔ لہٰذا اس مرحلے میں خطرناک ترین مرض جو کسی کو لاحق ہو سکتا ہے وہ ہے 'جلد بازی' اور اس جلد بازی کا لازمی نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ انسان جاہلیت کے سامنے ہتھیار ڈال دیتا ہے۔ یہ جلد بازی دراصل ان ہی سوالات سے جنم لیتی ہے جو صبر، انتظار اور مشکلات کو برداشت کرنے کا حوصلہ نہ ہونے کی وجہ سے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں۔ یہ جلد بازی انسان کو یہ باور کراتی ہے کہ وہ مستقل ایک ہی حالت پر سکون کے ساتھ چھپ چھپا کر بیٹھا ہوا ہے، اور بس! لیکن اسے یہ خیال نہیں رہتا کہ یہ انتظار دراصل ان عوامل اور صلاحیتوں کی تشکیل کا سبب ہے جو وقت کی ضرورت ہیں، جن سے فرار کی کوئی صورت نہیں۔

ان حالات کے مزاج کا تقاضا ہے کہ صبر و ثابت قدمی کو اپنے اوپر لازم کر لیا جائے۔ دیکھیے! زمین میں بیج اسی لیے ڈالا جاتا ہے کہ وہاں زمین میں اسے ان مراحل سے گزرنا ہوتا ہے کہ جس سے اس کی باہر آنے کے بعد والی صورت بنتی ہے، اور پھر باہر آنے کے بعد وہ اصل مقصد (پھل دینے) کے قابل ہوتا ہے۔ لیکن اگر زمین میں بیج ڈالنے کے بعد جلد بازی کے سبب، محنت، تکلیف اور انتظار سے جان چھڑانے کے لیے اسے باہر

نکال لیا جائے تو ایسا کرنا یقیناً یا تو اس کے لیے مزید تاخیر کا سبب ہے یا پھر اسے بالکل ہی بیکار کر کے رکھ دے گا۔

اس مرحلے میں بظاہر سکون سے بیٹھنے کو صفحہ تاریخ سے پوشیدگی یا راہِ عمل سے فرار قرار نہیں دیا جا سکتا۔ بلکہ اس کی مثال تو کمین (گھات) میں بیٹھے شخص کی سی ہے، کہ اُس کا سکون محض سکون نہیں بلکہ عین بیداری اور وقت کے مناسب عمل ہے، جو نہی شکار اس کی گھات میں آیا وہ جھٹ سے اسے اچک لے گا۔

پس داعی کے سکون کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے کام یعنی دعوت و تبلیغ کے بارے میں تمام مشکلات کے باوجود ثابت قدم رہے۔ دن ہو یا رات، خفیہ یا اعلانیہ اپنے کام میں جتا رہے۔ اسی طرح مجاہد کا بیٹھنا یہ ہے کہ وہ معرکے میں جمع رہے میدان میں جتنی بھی متوقع مشکلات آسکتی ہیں ان سب کے باوجود میدان نہ چھوڑے۔ اور قیدی کا بیٹھنا ایسے ہے جیسے نبی کریم ﷺ کا شعب ابی طالب میں تین سال تک بیٹھنا اور یوسف علیہ سلام کا جیل میں بیٹھنا۔ یہ سب سکون ایسے ہیں جیسے کسان زمین میں بیج ڈال کر اگلے مراحل کے انتظار میں بیٹھا ہو۔

ان جان توڑ لمحات کے سامنے ضعف اور شکست کے ظاہری آثار دیکھ کر بعض لوگ یہ سمجھ بیٹھتے ہیں کہ دعوت کے آغاز ہی میں یا کچھ دور چل لینے کے بعد انہیں یہ حالات کیوں پیش آئے؟ چنانچہ اس حالت کا تقاضہ ہے کہ ہم اپنے منشور اور نظریے کی نظر ثانی کریں، اور پھر اس نظر ثانی کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ جاہلیت کے کچھ نہ کچھ مطالبات اور پیش کشیں مان لیتے ہیں۔

یہ شکست ظاہری اور مادی بھی ہے اور علمی اور نظریاتی بھی۔ ظاہری اور مادی تو اس طرح کہ ایک دشمن نے دشمن کے سامنے گھٹنے ٹیک دیے۔ میدان میں اگرچہ شکست آ ہی جایا کرتی ہے۔ حتیٰ کہ انبیاء کے ساتھ بھی

یہی معاملہ ہے کہ ان کے دشمنوں کو بھی ان پر بعض اوقات غلبہ حاصل ہو جاتا تھا۔ جیسا کہ صحیح بخاری میں ابوسفیان اور ہرقل کا قصہ موجود ہے۔[1]

---

[1] ، عبد اللہ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ابن عباس سے سفیان بن حرب نے بیان کیا کہ ہرقل نے ان کے پاس ایک شخص کو بھیجا (اور وہ اس وقت قریش کے چند سرداروں میں بیٹھے ہوئے تھے اور وہ لوگ شام میں تاجر کی حیثیت سے گئے تھے (یہ واقعہ اس زمانے میں ہوا) جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابوسفیان اور دیگر کفار قریش سے ایک محدود عہد کیا تھا، غرض! سب قریش ہرقل کے پاس آئے، یہ لوگ اس وقت ایلیا میں تھے، تو ہرقل نے ان کو اپنے پاس دربار میں طلب کیا، اور اس کے گرد سرداران روم (بیٹھے ہوئے) تھے، پھر ان (سب قریشیوں) کو اس نے (اپنے قریب بلایا) اپنے ترجمان کو طلب کیا قریشیوں سے مخاطب ہو کر کہا کہ تم میں سب سے زیادہ اس شخص کا قریب النسب کون ہے، جو اپنے آپ کو نبی کہتا ہے؟ ابوسفیان کہتے ہیں، میں نے کہا میں ان سب سے زیادہ ان کا قریبی رشتہ دار ہوں، یہ سن کر ہرقل نے کہا کہ ابوسفیان کو میرے قریب کر دو اور اس کے ساتھیوں کو بھی اس کے قریب رکھو، اور ان کو ابوسفیان کی پس پشت کھڑا کر دو، پھر ترجمان سے کہا کہ ان لوگوں سے کہو کہ میں ابوسفیان سے اس شخص کا حال پوچھتا ہوں (جو اپنے آپ کو نبی کہتا ہے اگر مجھ سے جھوٹ بیان کرے، تو تم فوراً اس کی تکذیب کر دینا (ابوسفیان کہتے ہیں کہ) اللہ کی قسم اگر مجھے اس بات کی غیرت نہ ہوتی کہ لوگ میرے اوپر جھوٹ بولنے کا الزام لگائیں گے تو یقیناً میں آپ کی نسبت غلط باتیں بیان کر دیتا، غرض سب سے پہلے جو ہرقل نے مجھ سے پوچھا، وہ یہ تھا کہ اس نے کہا کہ اس کا نسب تم لوگوں میں کیسا ہے؟ میں نے کہا وہ ہم میں بڑے نسب والے ہیں، پھر ہرقل نے کہا کہ کیا تم میں سے کسی نے اس سے پہلے بھی اس بات (نبوت) کا دعوی کیا ہے؟ میں نے کہا نہیں (پھر ہرقل نے) کہا، کہ کیا ان کے باپ دادا میں کوئی بادشاہ گذرا ہے؟ میں نے کہا نہیں (پھر ہرقل نے) کہا کہ امیر لوگ ان کی پیروی کر رہے ہیں یا کمزور؟ میں نے کہا نہیں، بلکہ کمزور (پھر) ہرقل نے پوچھا آیا ان کے پیروکار (یوم فیوما) بڑھتے جاتے ہیں یا گھٹتے جاتے ہیں، میں نے کہا (کم نہیں ہوتے بلکہ) زیادہ ہوتے جاتے ہیں، ہرقل نے پوچھا، آیا ان میں سے کوئی شخص ان کے دین میں داخل ہونے کے بعد دین کی شدت کے باعث اس دین سے خارج بھی ہو جاتا ہے؟ میں نے کہا کہ نہیں (پھر ہرقل نے) کہا کہ کیا وہ کبھی وعدہ خلافی کرتے ہیں؟ میں نے کہا نہیں اور اب ہم ان کی مہلت میں ہیں ہم نہیں جانتے کہ وہ اس (مہلت کے زمانہ) میں کیا کریں گے (وعدہ خلافی یا ایفائے عہد)، ابوسفیان کہتے ہیں کہ سوائے اس کلمہ کے مجھے اور کوئی موقع نہ ملا کہ میں کوئی بات آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حالات میں داخل کر دیتا، ہرقل نے کہا آیا تم نے (کبھی) اس سے جنگ کی ہے؟ میں نے کہا ہاں، تو بولا تمہاری جنگ ان سے کیسی رہتی ہے، میں نے کہا کہ لڑائی ہمارے اور ان کے درمیان ڈول (کے مثل) رہتی ہے، کہ کبھی وہ ہم سے لے لیتے ہیں اور کبھی ہم ان سے لے لیتے ہیں (کبھی ہم فتح پاتے ہیں اور کبھی وہ) ہرقل نے پوچھا کہ وہ تم کو کیا حکم دیتے ہیں؟ میں نے کہا کہ وہ کہتے ہیں صرف اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو اور شرک کی باتیں جو تمہارے باپ دادا کیا کرتے تھے چھوڑ دو، اور ہمیں نماز پڑھنے اور سچ بولنے اور پرہیزگاری اور صلہ رحمی کا حکم دیتے ہیں ۔۔۔[صحیح بخاری]

لیکن اس ظاہری شکست کا حق و باطل کے میزان میں کوئی اعتبار نہیں۔ یہ تو دنوں کا ہیر پھیر ہے کبھی کوئی غالب تو کبھی کوئی۔ اور اس دنیا کا یہ فطری قاعدہ ہے جو کسی کے لئے بھی نہیں بدلتا۔ اس کو ذہناً شکست تسلیم کر لینے کا مطلب ہے باطل کے سامنے حق کی رسوائی، اور یہی تو دشمن کی سچی خوشی کا باعث ہے۔ چنانچہ پھر یہ سوچ لینے کے بعد دوبارہ اٹھ کھڑا ہونا اور میدان میں آنا بہت مشکل اور جان جوکھوں کا کام ہوتا ہے۔ بلکہ بسا اوقات اس گرداب سے نکلنے اور پھر عمل پیرا ہونے میں نسلیں ہی بدل جایا کرتی ہیں۔ اسے شکست مان کر بیٹھ جانے سے زمانے کے لئے ایک نمونہ اور مذاحمت کی عملی تصویر اس کی نظروں سے غائب ہو جاتی ہے۔ تاریخ کا ایک باب یکسر خاموش ہو جاتا ہے، اور یہی تو شیطان لعین کا مقصد اصلی ہے، یعنی مرد میدان کا صفح تاریخ سے گم ہو جانے کا مطلب ہے کہ آنے والی نسلوں کے لئے ہدایات اور رہنمائی کے لئے جو اتصال و تسلسل ناگزیر تھا وہ ٹوٹ چکا۔ بعض شکست خوردہ ذہن جو یہ کہتے ہیں کہ اس شکست نے انہیں اپنے افکار اور نظریات پر نظر ثانی اور سوچ بچار پر مجبور کیا ہے، تو یہ محض ان کا فاسد گمان ہے اور ہر گز قابل قبول نہیں! کیونکہ شدائد و مصائب، جیل کی کال کوٹھڑی اور صبر کے مرحلے میں ان کا یہ کہنا کیسے سچ ہو سکتا ہے؟ اسے کیسے قبول کی نگاہ سے دیکھا جا سکتا ہے؟ اس کا صاف مطلب ہے کہ یہ تنازل محض اپنے اوپر سے تکالیف اور مصائب کو ہٹانے یا کم کرنے کی قیمت ہے، اور بس! حقیقت اور صدق کی دنیا میں اس کا کوئی اعتبار نہیں۔ اس نفسیاتی شکست کو قبول کر لینے کی کوئی علمی توجیہ قابل قبول نہیں سوائے ظاہری لیپا پوتی اور فاسد تاویلات کے۔ آپ کا سابقہ موقف جو عام حالات میں تھا اب صبر کے مرحلے میں آکر اگر آپ اس سے انحراف کر لیں، اس کی غلطیاں گنوانے لگیں، اور اس مشکلات کے صبر طلب مرحلے میں ایک نیا موقف پیش کریں جس میں قدرے نرمی ہو تو لوگ اسے بھلا کیسے قبول کر سکتے ہیں! کیونکہ رسوخ فی العلم کا خاصہ ہے ثابت قدمی، جو یقین کامل اور علم صحیح کی بنیاد پر حاصل ہوتی ہے، لیکن بعض لوگ خود اپنے آپ کو دھوکے میں رکھتے ہیں یعنی آسان حالات میں اپنی کج فہمی اور قلت علم کو چھپانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں، لیکن جونہی حالات پلٹا کھاتے ہیں ان کے قدم لڑکھڑا جاتے ہیں ان کی کج فہمی اور علمی ناپختگی عیاں ہو جاتی ہے۔ ان سخت مشکل

حالات کا یہ بھی فائدہ ہے کہ ناقص علم اور کمزور عقیدے والوں کے لئے امتحان کا ذریعہ ہے، بایں طور کہ علم راسخ محض اچھا اعتقاد اپنا لینے کا نام نہیں جب تک کہ انسان اس علم کی اثر انگیزی ظاہری صورت میں نہ دیکھ لے۔ پس اسلام اور اس پر یقین محض اس حد تک نہیں ہونا چاہئے کہ یہ حق ہے بلکہ طبیعتوں اور مزاجوں پر اس کے اثرات کا ظاہر ہونا بھی ضروری ہے۔ رہ گئے وہ لوگ جو حق کو دنیاوی فوائد اور مادی اغراض کی وجہ سے قبول کرتے ہیں تو ان کے لئے قیادت و امامت کا وہ درجہ ثابت نہیں ہو سکتا جو ان لوگوں کو حاصل ہوتا ہے جو ان سب فوائد سے صرف نظر کرتے ہوئے حق کو قبول کرنے میں سبقت لے جاتے ہیں، غربت و اجنبیت کا ایک زمانہ گزار چکے ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ دشمن پر فتح اور نصرت کا ملنا بھی دنیاوی فوائد میں سے ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ اسے مومن کے دنیاوی اجر اور حصے میں شمار فرماتا ہے۔ اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

وَّاُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ۝[الصف:13]

”اور (ان نعمتوں کے علاوہ) ایک اور (نعمت بھی) ہے جس کو تم (دل سے) پسند کرتے ہو (یعنی) اللہ کی طرف سے مدد اور جلد فتح یابی (اے پیغمبر،) ایمان والوں کو (اس کی) خوشخبری سنادو۔“

راسخین فی العلم اور اہل ہدایت تو حق کو صرف اس لئے قبول کرتے ہیں کہ یہ محض اپنی ذات ہی میں حق ہے اس حقیقت کو سمجھنے کے لئے صبر اور انتظار کے کٹھن مراحل سے گزرنا از حد ضروری ہے۔ لوگوں کی گمراہی اور عام کفار کے کفر کی بنیاد یہی ہے کہ وہ حالات کے سامنے ہتھیار ڈال دیتے ہیں۔ اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ۝[الزخرف:23]

”ہم نے اپنے باپ دادوں کو ایک طریقے پر پایا اور انہی کے قدم بہ قدم ہم (بھی ان کی) پیروی کررہے ہیں۔“

حالانکہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس دنیا میں بھیجنے سے قبل ہی اسے اس بات سے باخبر کر دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰي شَهِدْنَا اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ ۝ اَوْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اَشْرَكَ اٰبَاۗؤُنَا مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا ذُرِّيَّةً مِّنْ بَعْدِهِمْ اَفَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ الْمُبْطِلُوْنَ ۝ [الاعراف:173،172]

”اور (اے پیغمبر، ان لوگوں کو وہ وقت بھی یاد دلاؤ) جب کہ تمہارے رب نے بنی آدم کی پشتوں سے ان کی نسلوں کو نکالا تھا اور انہیں خود ان کے اوپر گواہ بنایا (اور ان سے پوچھا تھا) کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ انہوں نے جواب دیا، ہاں ہم (اس بات کے) گواہ ہیں۔ (یہ ہم نے اس لئے کیا کہ) قیامت کے دن کہیں تم یہ نہ کہنے لگو کہ ہم تو اس بات سے بے خبر تھے۔ یا کہنے لگو ہمارے باپ دادا نے ہم سے پہلے شرک کیا تھا اور ہم ان کے بعد ان کی اولاد تھے کیا تو ہمیں اس کام پر ہلاک کرتا ہے جو گمراہوں نے کیا۔“

مَا مِنْ مَوْلُودٍ إِلَّا يُولَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ فَأَبَوَاهُ يُهَوِّدَانِهِ أَوْيُنَصِّرَانِهِ أَوْيُمَجِّسَانِهِ [2]

”ہر بچہ فطرت اسلام پر پیدا ہوتا ہے پھر اس کے ماں باپ اسے یہودی، عیسائی یا مجوسی بناتے ہیں۔۔۔“

یہ حدیث ان مذکورہ آیات کی تفسیر ہے۔

---

[2] [صحیح بخاری: جلد اول]

اہل ہدایت کی یہ شان نہیں کہ فتح و نصرت دیکھ کر ان کے ایمان میں اضافہ ہو جائے، اپنی اقدار پر اور مضبوطی پر جم جائیں اور ناکامی اور شکست دیکھ کر ان کے ایمان میں کمی آجائے اور قدم لڑکھڑا جائیں۔ حیرت کا مقام ہے کہ بعض لوگ جب یہ کہتے ہیں کہ انہیں صحیح حق راستے کا علم ان مشکل حالات میں ہوا ہے، یہ کہہ کر تو خود انہوں نے اپنے لئے طرح طرح کی تہمتوں کے دروازے کھول دیے۔ اب اگر کوئی یہ کہے کہ 'میں اس شخص کی ہرگز توثیق نہیں کر سکتا کہ اس نے تو آلام و مصائب کے دور میں اپنی اقدار اور عقیدے پر سودے بازی کر لی ہے' تو اس کا یہ کہنا اس کا حق ہے، بہت سے احکام شرعیہ بھی اس کی اس بات کی تائید میں موجود ہیں۔

ہاں! یہاں لیڈروں، رہنماؤں اور قیادتوں کے ذہن میں ایک اور سوال پھوٹتا ہے، یہ سوال دراصل آج کل کی سیاسی بصیرت، اور مصالحتی طرز عمل کا کرشمہ ہے۔ جس نے شریعت اور اس کی روح ہی کو ہلا کر رکھ دیا ہے! اس سوال ہی میں یہ اعتراف موجود ہے کہ صاحب سوال نے بلا و شدت کے مقابلے سے روگردانی اختیار کر لی ہے، اپنے اوپر مشقت کو کم کرنے کی خاطر دشمن کے کچھ نہ کچھ مطالبات مان لئے ہیں۔ یہ سوال اور اس کا جواب اس عظیم حدیث کی تشریح و توضیح میں اپنے مقام پر آجائے گا۔ یہ حدیث ان حالات میں دلوں کو لاحق ہونے والے امراض کی دوائے شافی ہے۔

حَدَّثَنَا قَيْسٌ عَنْ خَبَّابِ بْنِ الْأَرَتِّ قَالَ شَكَوْنَا إِلَى رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ مُتَوَسِّدٌ بُرْدَةً لَهُ فِي ظِلِّ الْكَعْبَةِ قُلْنَا لَهُ أَلَا تَسْتَنْصِرُ لَنَا أَلَا تَدْعُو اللَّهَ لَنَا قَالَ كَانَ الرَّجُلُ فِيمَنْ قَبْلَكُمْ يُحْفَرُ لَهُ فِي الْأَرْضِ فَيُجْعَلُ فِيهِ فَيُجَاءُ بِالْمِنْشَارِ فَيُوضَعُ عَلَى رَأْسِهِ فَيُشَقُّ بِاثْنَتَيْنِ وَمَا يَصُدُّهُ ذَلِكَ عَنْ دِينِهِ وَيُمْشَطُ بِأَمْشَاطِ الْحَدِيدِ مَا دُونَ لَحْمِهِ مِنْ عَظْمٍ أَوْ عَصَبٍ وَمَا يَصُدُّهُ ذَلِكَ عَنْ دِينِهِ وَاللَّهِ لَيُتِمَّنَّ هَذَا الْأَمْرَ حَتَّى يَسِيرَ الرَّاكِبُ مِنْ صَنْعَاءَ إِلَى حَضْرَمَوْتَ لَا يَخَافُ إِلَّا اللَّهَ أَوْ الذِّئْبَ عَلَى غَنَمِهِ وَلَكِنَّكُمْ تَسْتَعْجِلُونَ[3]

---

[3] [صحیح بخاری:]

''حضرت سیدنا خباب بن ارت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کعبہ اللہ کی چھاؤں میں سہارا لگائے بیٹھے تھے کہ ہم آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور یوں شکایت کی کہ کیا آپ ہمارے لئے اللہ سے مدد نہیں مانگتے کیا آپ ہمارے لئے دعا نہیں کرتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم سے پہلے کی امتوں میں آدمی کو لایا جاتا اور زمین میں گڑھا کھود کر اسے اس میں گاڑ دیا جاتا، پھر آرا لا کر اسے درمیان سے چیر کر اس کے دو ٹکڑے کر دیے جاتے اور لوہے کی کنگھیوں سے اس کی ہڈیوں پر سے گوشت اتار لیا جاتا۔ اس سب کے باوجود وہ اپنے دین پر قائم و دائم رہتا۔ اللہ کی قسم یہ دین ضرور پورا ہو کر رہے گا۔ یہاں تک کہ ایک سوار صنعاء سے حضر موت تک کا سفر کرے گا اور اسے اللہ کے سوا کسی کا خوف نہ ہو گا یا صرف اتنا کہ وہ اپنی بکریوں کے بارے میں بھیڑیے کا خوف کرتا ہو گا۔ لیکن تم جلد بازی کرتے ہو۔''

مکہ میں صحابہ کرام کے قریش کی طرف سے سختیاں جھیلنے میں مختلف درجے تھے بعض تو ایسے تھے جنہیں کسی کی کوئی حمایت حاصل نہ تھی، کوئی احترام اور سہارا نہ تھا۔ یہ لوگ سب سے زیادہ تکلیفیں برداشت کیا کرتے تھے۔ سیدنا خباب رضی اللہ عنہ بھی انہیں اہل ایمان میں سے تھے۔ ابن سعد نے شعبی سے روایت کیا ہے کہ حضرت خباب رضی اللہ عنہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس تشریف لے گئے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں اپنی مسند پر اپنے قریب بٹھایا اور فرمایا کہ روئے زمین پر اس جگہ بیٹھنے کا خباب سے زیادہ اور کوئی حقدار نہیں سوائے ایک شخص کے۔ حضرت خباب رضی اللہ عنہ نے پوچھا وہ کون۔ فرمایا کہ بلال رضی اللہ عنہ تو خباب رضی اللہ عنہ کہنے لگے اے امیر المومنین بلال رضی اللہ عنہ مجھ سے زیادہ حقدار کیسے ہوئے۔ بلال رضی اللہ عنہ کو تو اللہ کی طرف سے کوئی نہ کوئی مشرکین سے بچانے والا تھا جب کہ میرا تو کوئی بھی سہارا نہ تھا۔ ایک دن کفار نے مجھے پکڑا اور آگ جلا کر مجھے اس پر لٹا دیا، پھر ایک آدمی میرے سینے پر اپنا پاؤں رکھ کر کھڑا ہو گیا یہاں تک کہ زمین کا سینہ میری پشت کی چربی اور خون سے ٹھنڈا ہو گیا اور آگ بجھ گئی

۔ پھر انہوں نے اپنی پیٹھ حضرت عمرؓ کو دکھائی جو جھلس چکی تھی [4]۔ مسروق بن اجداع سے روایت ہے کہ حضرت خباب فرماتے ہیں کہ میں لوہار تھا اور عاص بن وائل پر میرا کچھ قرض تھا، میں قرض لینے کے لئے گیا تو اس نے کہا کہ پہلے محمد ﷺ کی نبوت کا انکار کرو پھر دوں گا۔ میں نے کہا ہر گز نہیں۔ تو مر کر دوبارہ زندہ ہو جائے تب بھی انکار نہ کروں گا۔ تو اس نے کہا کہ اچھا تو میں مر کر دوبارہ زندہ بھی ہوں گا۔ چلو تب ادا کر دوں گا جب میرا مال اور اولاد مجھے واپس ملے گا [5]۔ تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی: اَفَرَءَيْتَ الَّذِىْ كَفَرَ بِاٰيٰتِنَا وَقَالَ لَاُوْتَيَنَّ مَالًا وَّوَلَدًا ۝ اَطَّلَعَ الْغَيْبَ اَمِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا ۝ كَلَّا ۗ سَنَكْتُبُ مَا يَقُوْلُ وَنَمُدُّ لَهٗ مِنَ الْعَذَابِ مَدًّا ۝ وَّنَرِثُهٗ مَا يَقُوْلُ وَيَاْتِيْنَا فَرْدًا ۝ [مریم :80،79،78،77]

"کیا تو نے اس شخص کو دیکھا جس نے ہماری آیتوں کا انکار کیا اور کہتا ہے کہ مجھے ضرور مال اور اولاد ملے گی۔ کیا اس نے غیب کی خبر پالی ہے؟ یا خدا کے یہاں (سے) عہد لے لیا ہے؟ ہر گز نہیں ہم لکھ لیتے ہیں جو کچھ وہ کہتا ہے اور اس کے لیے عذاب بڑھاتے جاتے ہیں۔ اور جو چیزیں یہ بتاتا ہے ان کے ہم وارث ہوں گے اور یہ اکیلا ہمارے سامنے آئے گا۔"

حالانکہ سیدنا بلال رضی اللہ عنہ کو زیادہ تکالیف دی جاتی تھیں۔ عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سب سے پہلے سات لوگوں نے اپنا ایمان ظاہر کیا۔ رسول اللہ ﷺ ، ابو بکر، عمار، یاسر، اور ان کی والدہ سمیہ، صہیب، بلال اور مقداد (رضی اللہ عنہم اجمعین)۔ رسول اللہ ﷺ کو اپنے چچا ابو طالب کی حمایت حاصل تھی اور ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو ان کے قومی تعلق کی بنا پر کچھ رعایت حاصل تھی۔ جبکہ باقی صحابہ میں سے سب کو مشرکین لوہے کی زرہیں پہنا کر دھوپ میں تڑپتا چھوڑ دیتے تھے۔ ان میں سے سوائے بلال کے باقی سب کے ساتھ کچھ نہ کچھ رعایت ہوتی لیکن بلال کے لئے کوئی رعایت نہ تھی، قریش

---

[4] [الطبقات الکبریٰ، المعروف بالطبقات ابن سعد]

[5] [صحیح بخاری]

کے بچے انہیں پکڑ کر گلیوں میں گھسیٹتے پھرتے اور یہ احد احد پکارتے رہتے[6]۔ جن لوگوں کو نسب یا کسی اور وجہ سے کوئی سہارا تھا ان کا بھی ایسا معاملہ نہ تھا کہ ان کو بالکل تکلیف نہ دی جاتی بلکہ اللہ کے راستے میں ایذاء اور اس پر صبر میں ان کا بھی وافر حصہ تھا۔ خود رسول اللہ ﷺ کو اپنے چچا ابو طالب کی حمایت حاصل تھی لیکن اس کے باوجود قریش کی طرف سے طرح طرح کے مظالم سہتے تھے۔ عروہ بن زبیر کہتے ہیں کہ میں نے عمرو بن عاص سے پوچھا، قریش نے آپ کو جو سخت ترین تکلیف دی ہے اس کا واقعہ مجھے سنائیں۔ تو عمرو بن العاص نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ کعبۃ اللہ میں کھڑے نماز میں مصروف تھے کہ عقبہ بن ابی معیط آیا اور آپ ﷺ کی گردن میں کپڑا ڈال کر پورے زور سے کھینچا، تو اتنے میں حضرت ابو بکر صدیق آئے اور اسے کندھوں سے پکڑ کر آپ ﷺ سے دور کیا اور یہ آیت تلاوت فرمائی۔[7]

أَتَقْتُلُونَ رَجُلًا أَنْ يَقُولَ رَبِّيَ اللّٰهُ وَقَدْ جَاءَكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ مِنْ رَّبِّكُمْ

" کیا تم ایسے شخص کو قتل کرنا چاہتے ہو جو کہتا ہے کہ میرا پروردگار اللہ ہے اور وہ تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے نشانیاں بھی لے کر آیا ہے"

اسی طرح مسند احمد کی ایک طویل روایت ہے:

عروہ بن زبیر سے مروی ہے کہتے ہیں کہ میں نے ایک دن عبد اللہ بن عمرو سے کہا کہ مجھے ایسے سخت ترین واقعے کے متعلق بتایئے ،جو قریش نے آپ ﷺ کے ساتھ روا رکھا ہو، انہوں نے کہا ایک دن سرداراں قریش حطیم میں جمع تھے میں بھی وہاں موجود تھا، وہ لوگ نبی کریم ﷺ کا تذکرہ کرنے لگے اور کہنے لگے کہ ہم جتنا صبر اس آدمی پر کیا اتنا کسی اور پر نہیں کیا، اس نے ہمارے عقلمندوں کو بے وقوف کہا، ہمارے آباؤ اجداد کو برا بھلا کہا، ہمارے دین عیب نکالے، ہماری جماعت کو منتشر کیا اور ہمارے معبودوں کو برا بھلا کہا۔ ہم نے ان کے معاملے میں بہے صبر کر لیا! اسی اثنا میں آپ ﷺ تشریف لائے اور حجر اسود کو بوسہ دیا

---

[6] [مسند احمد، ابن ماجہ]

[7] [صحیح بخاری]

اور پھر طواف کرتے ہوئے نبی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم ان کے سامنے سے گذرے تو وہ ایک دوسرے کو آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم سے متعلق طنزیہ اشارے کرنے لگے، مجھے نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے چہرہ مبارک پر اس کے اثرات معلوم ہوئے، تین چکروں میں اسی طرح ہوتا رہا۔ بالآخر آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا: اے قریش والو! سنو! اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں محمد صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کیجان ہے، 'لقد جئتکم بالذبح' میں تمہیں ذبح کرنے آیا ہوں، تو آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی یہ بات سن کر وہ سب کے سب ہکا بکا رہ گئے، حتیٰ کہ پہلے جو جتنا سخت تھا وہ اب اتنا احسن انداز میں بات کرنے لگا، کہنے لگا کہ، اے ابو القاسم! بخدا

آپ ناواقف نہیں، جایئے! بخیر وعافیت تشریف لے جایئے! تو رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم وہاں سے چلے گئے۔ اگلے دن پھر وہ لوگ حطیم میں جمع ہوئے، میں بھی ان کے ساتھ تھا، وہ لوگ کہنے لگے کہ پہلے تو تم اس (نبی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم) سے پہنچنے والی تکلیف دہ باتوں کا تذکرہ کر رہے تھے لیکن جب وہ تمہارے سامنے آئے تو تم نے اسے چھوڑ دیا! کہ اتنے میں رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم آئے تو وہ سب اکٹھے کود ے اور آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو گھیر لیا اور کہا کہ کیا تم ہمارے معبودوں کے متعلق ایسی ایسی باتیں کرتے ہو؟ نبہ کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا: ہاں میں یہ کہتا ہوں! راوی کہتے ہیں کہ میں دیکھ کہ ان میں سے ایک نے آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم چادر کو گلے سے پکڑا اور گھونٹنا شروع کر دیا۔ یہ دیکھ کر سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو بچانے کے لیے دوڑے، اور وہ روتے ہوئے یہ آیت پڑھ رہے تھے: اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ يَّقُوْلَ رَبِّيَ اللّٰهُ وَقَدْ جَآءَكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ مِنْ رَّبِّكُمْ ؕ

" کیا تم ایسے شخص کو قتل کرنا چاہتے ہو جو کہتا ہے کہ میرا پروردگار اللہ ہے اور وہ تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے نشانیاں بھی لے کر آیا ہے"

تو وہ لوگ چلے گئے۔ یہ سب سخت دن تھا، اس سے پہلے کبھی رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو اتنی سخت تکلیف نہیں دی گئی۔"[8]

---

[8] [مسند احمد]

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا اپنا حال کیا تھا؟ ان کی صاحبزادی حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما فرماتی ہیں کہ جب ابو بکرؓ نے آپ ﷺ سے ان لوگوں کو دور کیا اور یہ آیت پڑھی تو وہ آپ ﷺ کو چھوڑ کر حضرت ابو بکر کے درپے ہوگئے۔ جب وہ گھر آئے تو ان کے سر کے بال ان کے ہاتھ میں تھے اور کہہ رہے تھے: **تبارکت یا ذاالجلال والاکرام**[9]

یہ تھی اس وقت مکہ میں اہل ایمان کی حالت اور یہ زمانہ اتنا طویل تھا کہ بعض حضرات یہ خیال کرنے لگے کہ شاید حالات ہمیشہ ایسے ہی رہیں گے ۔ حضرت عثمانؓ فرماتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ وادی بطحاء سے گزر رہا تھا ، وہاں ہم نے دیکھا کہ حضرت عماران کے والد یاسر اور ان کی والدہ سمیہ رضی اللہ عنہم اجمعین کو دھوپ کے اندر تعذیب دی جا رہی تھی۔ تو ہمیں دیکھ کر حضرت ابو عمارؓ نے کہا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ ہمارا حال تو دیکھیے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا '**صبراً یا آل یاسر**'۔ یعنی صبر !اے آلِ یاسر! پھر فرمایا:

'**اللہم اغفر لآل یاسر وقد فعلت**' اے اللہ آل یاسر کی مغفرت فرما۔ اور یقیناً تو نے ان کو معاف کر دیا ہے۔[10]

رسول اللہ ﷺ کے سامنے حضرت خباب نے جو سوال کیا اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ جب مدت اتنی طویل ہوگئی برسوں گزر گئے قریش کے رویے میں کوئی فرق نہ آیا اور ظاہر میں امید کی کوئی ایسی کرن نظر نہیں آئی کہ جس سے دل کو تسلی ہو کہ حالات آہستہ ہی صحیح تبدیلی کی طرف رواں ہیں۔ نہیں، بلکہ صرف انتظار اور انتظار ہے۔ جوں جوں وقت گزرتا جاتا ہے درد کی کلفت اور شدت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ نفس کے اندر ہی ایک جھگڑا بڑھتا جاتا ہے۔ یہی جھگڑا اور اندر کی لڑائی دراصل امتحان ہے کہ رب کی نصرت کے

---

[9] [مسند الحمیدی]

[10] [جامع المسانید والمراسیل]

وعدے پر کتنا یقین ہے۔ہے بھی یا نہیں۔ کچھ بعید نہیں کہ ایسے حالات میں حضرت خبابؓ کے ذہن میں یہ سوال[11] پیدا ہوا ہو! ہو جو آج راستے کی طوالت دیکھ کر جلد نتائج چاہنے والوں کے ذہنوں میں پھوٹتا ہے کہ مسئلہ ہم میں ہے۔

'' کہ ہم نے جس نعرے نظریے اور شعار کو پہلے دن اپنایا تھا، آج بھی اسی پر جمود اختیار کیے بیٹھے ہیں کہ 'یا تم رہو گے یا ہم! ہمارے تمہارے دین میں، ہماری تمہاری اقدار میں، کبھی کوئی سمجھوتہ نہیں ہو سکتا!۔ عجیب! شاید ہم خواہ مخواہ اس امکانی غرور (خوش فہمی) میں مبتلا ہیں کہ آنے والا کل ہمارا ہے! ہم ہی مستقبل میں اپنے دین کے ساتھ باقی رہیں اور باقی تمام اہلِ باطل اپنے باطل سمیت مٹ جایئں گے؟ یہ سب رکاوٹ اسی جمود (بالکل غیر لچکدار مؤقف) کی وجہ سے ہے! اندھیری رات ہے! روشنی کی کوئی کرن دکھائی نہیں دے رہی! بس اب نتائج اگلی نسل کے سپرد کرتے ہیں اور اس وقت سیاسی بصیرت کا تقاضہ یہی ہے کہ اس وقت اپنے وجود کی بقاء اہم ہے'' جسکا کا ایک ہی طریقہ ہوتا ہے کہ مقابل سے کسی حد تک صلح کر لی جائے یعنی کچھ لے کچھ دے کا معاملہ۔۔۔

کیسے ہو سکتا ہے؟ وہم ہے یہ! وہم سے زیادہ کچھ نہیں! یہ نام نہاد حکمت دراصل دین کی بنیاد پر لڑنے سے جان چھڑانا چاہتی ہے۔اس کا مقصد دو فریقوں کے درمیان دنیاوی اغرض کے لئے صلح ہے۔

کہتے ہیں کہ 'اتنا زمانہ ہو گیا ہمیں کوئی کامیابی نہیں ملی، ذرا ان کو تو دیکھیے جنھوں نے مصلحت اختیار کی آج ان کے گرد کتنے لوگ جمع ہیں۔انہوں نے اپنی جڑیں مضبوط کر لی ہیں۔اپنے افکار و نظریات کا از سر نو جائزہ لیا اور ہم ہیں کہ پورے کے پورے دین کی بات کرتے ہیں یہ تو وقتی سیات کے منافی ہے۔اسی لئے تو جہاں سے چلے تھے وہیں کے وہیں کھڑے ہیں۔'

---

[11] یہاں سے 'مصنف علام' اس سوال اور جواب کی تفصیل شروع کر رہے ہیں جس کا ذکر اس حدیث سے پہلے کیا تھا۔یہی دراصل کتاب کا اصل موضوع ہے۔یا شاید اس تصنیف کا سبب بھی! واللہ اعلم (مترجم)

جی ہاں! ایسے ہی کہتے ہیں آج کل کے دانشور اور اسلامی سیاست کے ٹھیکیدار! جن میں انتظار کا حوصلہ نہیں! صبر کی مشقت جنہیں چکنا چور کیے دیتی ہے۔ جب یہ لوگ میدان چھوڑ کر چلے جاتے ہیں تو پیچھے رہ جانے والے صابرین پر آلام و مصائب اور بڑھ جاتے ہیں۔ جبکہ ان بھاگ جانے والوں کو دکھاوے کی بناوٹی کامیابی کے کچھ آثار مل جاتے ہیں۔ تب صابرین اپنے قائدین سے آکر پوچھتے ہیں کہ کیا یہی زمانے کی روش ہے؟
تو ان کے پاس اپنے لئے اور اپنے پیروکاروں کے لئے صرف ایک ہی جواب ہوتا ہے۔۔۔ صبر!!

یہ حضرت خباب رسول اللہ ﷺ کے پاس کفار سے کوئی صلح اور امن پیش کش، یا صبر و ثابت قدمی کے علاوہ کفار سے مقابلے کی کوئی نئی سکیم لے کر نہیں آئے تھے، بلکہ صرف اس لئے کہ اللہ کے رسول ان کے لئے اللہ سے دعا کریں۔ دعا اس بات کی کہ ان پر سختی میں کچھ کمی ہو جائے یا دشمن کی تباہی کے ذریعے اللہ تعالیٰ ان کی نصرت فرمائے۔ جیسا کہ نوح علیہ السلام نے دعا مانگی تھی:

وَقَالَ نُوحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكَافِرِينَ دَيَّارًا ﴿٢٦﴾ [نوح : 26]

"اور نوح نے کہا اے میرے رب زمین پر کافروں میں سے کوئی رہنے والا نہ چھوڑ"

یہ محض دعا تھی کہ تبدیلی یا کم از کم اس کے کچھ آثار ہی نمودار ہوں، سختیاں اپنی انتہاء کو پہنچ چکی تھیں بھلا اس میں ناراض ہونے کی کوئی بات تھی؟ لیکن رسول اللہ ﷺ اٹھ کر بیٹھ گئے، آپ کا چہرا مبارک غصے سے سرخ ہو چکا تھا کہ ایسا سوال کیوں کیا! جس میں ایک گونا شکایت ہے!

اس لئے کہ ایمان باللہ کی ایک تاریخ ہے اور ہر ایمان کا دعویٰ کرنے والے کو اس تاریخ سے گزرنا ہو گا۔ جیسا کہ بچے کے لئے رحم مادر میں ایک وقت تک کے لئے رہنا طے ہے۔ صحیح سالم دنیا میں آنے کے لئے اس مدت کا طے ہونا ناگزیر ہے انسان اس مدت کی بخیر و عافیت پورا ہونے کی اپنے رب سے دعا کرتا ہے۔ تاکہ بچہ بے عیب ہو۔ پس اس لئے غیر فطری طریقے کے ذریعے کسی امر کی دعا مانگنا یہ زیادتی ہے، جیسا کہ رحم مادر میں بچہ کتنی مدت رہے گا یہ بات فطرتاً طے ہے کوئی اس مدت کے جلد ختم ہونے کی دعا مانگ سکتا ہے؟ یا کوئی رحم مادر کے بغیر ہی بچے کی پیدائش کی امید کر سکتا ہے؟ اسی وجہ سے نبی کریم ﷺ نے اس طلب پر ناراضی کا اظہار

فرمایا۔ دعا تقدیری معاملات میں بھی شرعاً جائز ہے کیونکہ دعا بھی تقدیری اسباب میں سے ایک سبب ہے۔ لیکن سبب کا تصور غیر فطری طریقے سے جائز نہیں۔ بسا اوقات اسباب حرام طریقے سے اختیار کیے جاتے ہیں جیسے جادو کے ذریعے سے شفا طلبی یا شراب سے علاج کی کوشش۔ اور کبھی ایسا سبب اختیار کیا جاتا ہے جس کا شریعت یا فطرت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا جیسے ہوا کے ذریعے بھوک یا کمزوری کا علاج۔ اور کبھی ایسا سبب اختیار کیا جاتا ہے جو فطرت کے خلاف اور شرعاً بدعت ہوتا ہے جیسے کوئی یہ کہے صوفی رقص، اس کے لئے شفایاب چیز ہے یا زیادتی رزق کا باعث ہے۔

سیدنا خباب رضی اللہ عنہ کے سوال اور طلبِ دعا میں دو احتمالات یا ان دو میں سے ایک ہو سکتا تھا۔

- یا تو وہ یہ چاہتے تھے کہ ایمان کے ساتھ ابتلاء و آزمائش جو لازم ہے اس میں کچھ کمی کی جائے، اور یہ ہو نہیں سکتا۔ کیونکہ یہ حق تعالیٰ کی مقرر کردہ ایک سنت جاریہ ہے اور یہ اس میں ترمیم کی طلب ہے۔
- اور دوسرا احتمال یہ ہو سکتا ہے کہ وہ فطری مناسب اور مقرر وقت سے پہلے انجام اور نتیجہ چاہ رہے تھے۔

اسی وجہ سے آپ ﷺ اس سوال اور طلبِ دعا پر ناراض ہوئے اور آپ نے جو جواب عنایت فرمایا اس میں ان دونوں باتوں کا رد موجود ہے۔ دیکھیے! کہ آپ ﷺ ان مطالبات کو رد فرما رہے ہیں حالانکہ یہ شرعی طریقے سے طلب کیے گئے تھے، اگر یہ سوال اور طلب غیر شرعی طریقے مثلاً اپنے برحق عقیدے میں تبدیلی یا کمی کی خواہش سے ہوتی تو کیا ہوتا!۔

ایمانی تاریخ اور اس پر گزرنے والے مراحل سے قطعاً کوئی راہ فرار نہیں! اگر کسی وقت میں کسی گروہ یا فرد کو ان حالات سے سابقہ نہیں پڑا یا اس کے لئے کوئی تخفیف ہوئی تو یہ اس کی ایمانی کمزوری کی علامت ہے کیونکہ ابتلاء کی شدت ایمان کی پختگی کے بقدر ہوتی ہے۔

عَنْ مُصْعَبِ بْنِ سَعْدٍ عَنْ أَبِيهِ قَالَ قُلْتُ يَا رَسُولَ اللَّهِ أَيُّ النَّاسِ أَشَدُّ بَلَاءً قَالَ الْأَنْبِيَاءُ ثُمَّ الصَّالِحُونَ ثُمَّ الْأَمْثَلُ فَالْأَمْثَلُ مِنْ النَّاسِ يُبْتَلَى الرَّجُلُ عَلَى حَسَبِ دِينِهِ فَإِنْ كَانَ فِي دِينِهِ صَلَابَةٌ زِيدَ فِي بَلَائِهِ وَإِنْ كَانَ فِي دِينِهِ رِقَّةٌ خُفِّفَ عَنْهُ وَمَا يَزَالُ الْبَلَاءُ بِالْعَبْدِ حَتَّى يَمْشِيَ عَلَى ظَهْرِ الْأَرْضِ لَيْسَ عَلَيْهِ خَطِيئَةٌ[12]

> ''مصعب ابن سعد اپنے والد سے روایت کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا سب سے زیادہ آزمائشیں کن لوگوں پر آتی ہیں تو آپ ﷺ نے جواب میں فرمایا انبیاء پر پھر صالحین پر اور پھر عام لوگوں میں جس کا ایمان جس قدر زیادہ ہو گا۔ جو دین میں پختہ ہو گا اس کی ابتلاء بھی سخت ہو گی۔ اور جس کا ایمان کمزور ہو گا اس کی آزمائش ہلکی ہو گی۔ حتیٰ کہ آدمی کی یہ حالت ہو جاتی ہے کہ وہ زمین پر چلتا پھرتا ہے اور اس پر ذرہ برابر گناہ کا بوجھ نہیں ہوتا۔''

ایمان میں کئی چیزیں داخل ہیں۔ جن میں سے ایک حق کو، اس کے اصول اور احکام کو مضبوطی سے تھامے رکھنا بھی ہے۔ جب جاہلیت مطالبہ کرتی ہے کہ مومن شرعی اصول اور احکام میں سے کسی اصول یا حکم سے دست بردار ہو جائے، تو اگر وہ مومن اس وقت حق کو چھپانے کی کوشش کرے یا کوئی تاویل پیش کرے یا اس سے کچھ وقت کے لئے ہی دست بردار ہو جائے تو جاہلیت اس کے لئے کچھ نرمی کر دیتی ہے اس کی رسی کو ڈھیلا چھوڑ دیتی ہے اور اس سے کچھ نہ کچھ راضی بھی ہو جاتی ہے، تو اس کا مطلب یہی ہے کہ اس شخص کا ایمان کمزور ہے۔ یہی ہمیں رسول اللہ ﷺ نے بتایا ہے۔ ایمانی اقدار اور ایمانی تاریخ بھی یہی بتاتی ہے۔ لیکن آج کل کے مفکرین اسے دعوت کی حکمت، دشمن سے مقابلے کی سیاست اور حسن بصیرت کا نام دیتے ہیں!۔ ذرا دیکھیے تو! جادوگر جب موسیٰ اور ہارون علیہ السلام پر ایمان لے آئے، فرعون کی خدائی کا صاف انکار کیا تو ان کے سامنے یقینی موت اور پھانسی کی سزا تھی۔ فرعون نے اسی کا ان سے وعدہ کیا تھا۔ تو اس وقت

---

[12] [مسند احمد]

انہوں نے تبدیلی حالات کی دعا نہیں مانگی! اور نہ ہی اپنا موقف بدلا! بس اس وقت ان کی زبانوں پر ایک ہی دعا تھی:

رَبَّنَآ اَفۡرِغۡ عَلَيۡنَا صَبۡرًا وَّ تَوَفَّنَا مُسۡلِمِيۡنَ۝ [الاعراف:126]

"اے پروردگار! ہم پر صبر و استقامت کے دہانے کھول دے اور ہمیں (اپنی) فرمانبرداری کی حالت میں (دنیا سے) اٹھا۔"

کیونکہ جب آدمی تختہ دار پر موجود ہو، شہادت اور رب کی ملاقات سامنے نظر آ رہی ہو، اگر وہ اس وقت خائف ہو کر تبدیلی حالات کی دعا کرنے لگے کہ یہ مشکل ٹل جائے اور یہ جام شہادت اس سے ہٹا لیا جائے تو یہ ایمان کی کمزوری نہیں تو اور کیا ہے؟ ایسے آدمی کو اس وقت یہی کہا جائے گا کہ صبر اور اجر کی امید کے ساتھ اس مقام پر ثابت قدم ہو جاؤ اور اللہ سے یہ دعا مانگو کہ وہ اس تجارت کو قبول فرمائے اور اس کے گناہ بخش دے۔

یہی رسول اللہ ﷺ کا طرز عمل تھا۔ اسی کی آپ ﷺ اپنے صحابہ کو نصیحت فرماتے تھے کہ ڈٹ جاؤ، صبر کرو، اللہ سے ثابت قدمی مانگو، یہاں تک کہ اللہ کا وعدہ جس کا وقت مقرر ہے آن پہنچے۔

اگر کوئی عورت ایام حمل میں اپنی بہن، بھائی یا شوہر سے کہے کہ اسے بہت تکلیف کا سامنا ہے اس کے لئے دعا کریں کہ ولادت کا معاملہ اپنے فطری وقت سے قبل ہی پورا ہو جائے، تو وہ اس عورت کا یہ مطالبہ ہرگز قبول نہیں کریں گے، بلکہ اسے صبر کی تلقین کریں گے اور خود بھی اللہ سے دعا کریں گے کہ اے اللہ اسے صبر دے! اور اس معاملے کو بخیر و عافیت انجام تک پہنچا! اس صورت میں یہ معاملہ اپنی فطری مدت پورا کرنے پر ہی تمام ہو گا۔ لیکن یہاں عورت کے پاس ایک اور حل بھی ہے! اور وہ ہے اسقاط حمل! بالکل اسی طرح جسے اللہ کے راستے کی تکلیفیں دی جائیں تو اس کے سامنے بھی ایک راستہ ہوتا ہے کہ یا تو پورے کا پورا ایمان سے ہاتھ دھو بیٹھے یا کم از کم دشمن سے کچھ صلح ہی کر لے۔ اعاذنا اللہ منہ

اکثر لوگ ایسا ہی کرتے ہیں، کہ کچھ لے کچھ دے کا معاملہ ایسا کرنے سے مطلوب تو حاصل ہو جاتا ہے یعنی ابتلاء میں کمی ہو جاتی ہے لیکن اس کے بدلے میں وہ ایک عظیم مرتبے سے محروم رہ جاتے ہیں یعنی درجہ امامت اور قیادت جو ان کے انتظار میں ہوتا ہے۔ اللہ کی نصرت اور تائید کے ساتھ یہ درجہ بھی صابرین کے انتظار میں ہوتا ہے۔ **وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا وَكَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يُوْقِنُوْنَ**۝[**السجدہ**:24]

"اور ہم نے ان میں سے پیشوا بنائے تھے جو ہمارے حکم سے رہنمائی کرتے تھے جب
انہوں نے صبر کیا تھا اور وہ ہماری آیتوں پر یقین بھی رکھتے تھے"

نصرت کا یہ میٹھا پھل ان سے جاتا رہتا ہے! اور یہ اس کی نسبت زیادہ سخت بات ہے جو انہوں نے اختیار کی، کاش کے وہ جان لیتے!

جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا کہ حضرت خباب کے سوال میں ان کا مطلوب دو چیزیں ہو سکتی تھیں۔ اوّل تغییر حال کہ سختی میں کچھ کمی ہو جائے۔ اس کا علاج صبر ہے اور تاریخ ایمان کا مطالعہ، کہ ایمان اور ابتلاء کے درمیان ایک قدرتی رشتہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **الٓمّٓ۝اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ۝ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ**۝[**العنکبوت**:1،2،3]

"الف۔ لام۔ میم۔ کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ محض اتنا کہنے پر چھوٹ جائیں گے کہ ہم ایمان لے آئے اور ان کو آزمایا نہ جائے گا؟ اور جو لوگ ان سے پہلے ہو چکے ہیں ہم نے انکو بھی آزمایا تھا (اور انکو بھی آزمائیں گے) سو اللہ ان کو ضرور معلوم کرے گا جو (اپنے ایمان میں) سچے ہیں اور ان کو بھی جو جھوٹے ہیں۔"

ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَمۡ حَسِبۡتُمۡ اَنۡ تَدۡخُلُوا الۡجَنَّةَ وَلَمَّا يَاۡتِكُمۡ مَّثَلُ الَّذِيۡنَ خَلَوۡا مِنۡ قَبۡلِكُمۡ‌ؕ مَسَّتۡهُمُ الۡبَاۡسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلۡزِلُوۡا حَتّٰى يَقُوۡلَ الرَّسُوۡلُ وَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا مَعَهٗ مَتٰى نَصۡرُ اللّٰهِ‌ؕ اَلَاۤ اِنَّ نَصۡرَ اللّٰهِ قَرِيۡبٌ ۝ [البقرہ:214]

"کیا تم خیال کرتے ہو کہ یونہی جنت میں داخل ہو جاؤ گے؟ حالانکہ تمہیں وہ (حالات) پیش نہیں آئے جو ان لوگوں کو پیش آئے جو تم سے پہلے ہو گزرے ہیں انہیں سختی اور تکلیف پہنچی اور ہلا دیئے گئے یہاں تک کہ رسول اور جو اس کے ساتھ ایمان لائے تھے بول اٹھے کہ اللہ کی مدد کب ہو گی سنو بیشک اللہ کی مدد قریب ہے۔"

اور اس معنیٰ کی دیگر آیات دیکھ لی جائیں۔

دوسرا مطلوب تھا ایمان کے ثمرے (نصرت) کا جلد طلب کرنا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: حَتّٰى يَقُوۡلَ الرَّسُوۡلُ وَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا مَعَهٗ مَتٰى نَصۡرُ اللّٰهِ‌ؕ اَلَاۤ اِنَّ نَصۡرَ اللّٰهِ قَرِيۡبٌ ۝ [البقرہ:214]

"یہاں تک کہ رسول اور جو اس کے ساتھ ایمان لائے تھے بول اٹھے کہ اللہ کی مدد کب ہو گی سنو بیشک اللہ کی مدد قریب ہے۔"

یہاں ان دونوں معنوں میں دعا نہ ہی مطلوب ہے اور نہ ہی شرعاً جائز۔ اسی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے اس درخواست کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

نبی کریم ﷺ کی سیرت کے قاری کے لئے یہاں اس بات کا علم بھی مفید ہو گا کہ آپ ﷺ سے جب دعا کی درخواست کی جاتی تو کبھی تو اسے قبول فرما لیتے جیسا کہ متعدد احادیث موجود ہیں جن میں سے ایک سیدنا انس رضی اللہ عنہ کی رویت کردہ یہ حدیث ہے۔

انس بن مالک رضي اللہ تعالی عنہ فرماتے ہیں: کہ ایک شخص جمعہ کے دن اس دروازہ سے مسجد میں داخل ہوا جو منبر کے سامنے تھا اور رسول اللہ صلي اللہ علیہ وسلم کھڑے خطبہ دے رہے تھے، اس نے کھڑے کھڑے رسول اللہ صلي اللہ علیہ وسلم کي طرف منہ کیا اور کہا کہ یا رسول اللہ صلي اللہ علیہ وسلم لوگوں کو مال تباہ ہوگیا، راستے بند ہوگئے اس لیے آپ اللہ سے دعا کریں کہ بارش برسائے، انس رضي اللہ تعالی عنہ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھائے اور فرمایا کہ اے میرے اللہ ہمیں سیراب کر، اے میرے اللہ ہمیں سیراب کر، اے میرے اللہ ہمیں سیراب کر، انس رضي اللہ تعالی عنہ نے بیان کیا کہ بخدا اس وقت آسمان پر نہ تو کوئي بادل اور نہ بادل کا کوئي ٹکڑا اور نہ کوئي چیز نظر آتي تھي اور نہ ہمارے اور سلع کے درمیان کوئي گھر یا مکان تھا، سلع کے پیچھے سے ڈھال کے برابر ایک ابر کا ٹکڑا نمودار ہوا، جب وہ آسمان کے بیچ میں آیا تو وہ بدلی پھیل گئ، پھر بارش ہونے لگی، بخدا پھر ہم لوگوں نے ایک ہفتہ تک آفتاب نہیں دیکھا، پھر ایک شخص اسی دروازے سے دوسرے جمعہ کے دن مسجد میں داخل ہوا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے خطبہ دے رہے تھے وہ شخص آپ ﷺ کي طرف منہ کرکے کھڑا ہوا اور کہا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کا مال تباہ ہوگیا اور راستے بند ہوگئے، اس لئے اللہ تعالی سے دعا کیجیے کہ بارش بند کردے، تو رسول اللہ ﷺ نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھائے پھر فرمایا اے اللہ ہمارے اردگرد برسا، ہم پر نہ برسا اے میرے اللہ پہاڑوں، ٹیلوں اور وادیوں اور درختوں کے اگنے کي جگہوں پر برسا، راوي کا بیان ہے کہ بارش تھم گئي اور ہم

دھوپ میں چلتے ہوئے باہر نکلے، شریک(راوی) کا بیان ہے کہ میں نے انس رضي الله تعالى عنه سے پوچھا وہ پہلا ہی آدمی تھا؟ انس رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں نہیں جانتا۔[13]

اسی طرح جریر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ نے درخواست کی کہ میں گھوڑے پر مضبوطی سے جم کر نہیں بیٹھ سکتا میرے لئے دعا فرمایئے تو کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے میرے سینے پر ہاتھ مارا اور فرمایا: **اللَّهُمَّ ثَبِّتْهُ وَاجْعَلْهُ هَادِيًا مَهْدِيًّا** اے اللہ جریر کو گھوڑے پر ثبات عطا فرما اور ہدایت کرنے والا اور ہدایت یافتہ بنا۔[14]

یا جیسے حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا (والدہ حضرت انسؓ) نے آپ ﷺ سے عرض کیا کہ انس رضی اللہ عنہ آپ کا خادم ہے اس کے لئے دعا فرمایئے۔ تو آپ ﷺ نے یوں دعا فرمائی: ' **اللَّهُمَّ أَكْثِرْ مَالَهُ وَوَلَدَهُ وَبَارِكْ لَهُ فِيمَا أَعْطَيْتَهُ** ' یعنی اے اللہ انسؓ کے مال و اولاد میں زیادتی فرما، اور جو کچھ تو نے اسے عطا کیا ہے اس میں برکت عطا فرما![15]

اسی طرح لوگ آپ سے بارش کے لئے دعا کی درخواست کرتے تو آپ ﷺ دعا فرما دیتے۔

بسا اوقات آپ سائل کو اختیار دیتے کہ آپ اس کے لئے دعا فرمائیں اور اس کی حاجت پوری ہو جائے یا دعا نہ فرمائیں بلکہ بعد میں اس کو اس کی حاجت سے بہتر چیز مل جائے۔

عطا بن رباح سے روایت ہے کہ ایک عورت آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کی کہ مجھے مرگی کا دورہ ہوتا ہے اور میں بے پردہ ہو جاتی ہوں میرے لئے دعا فرمایئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر تو چاہے تو صبر کرے تیرے لئے جنت ہو گی اور اگر چاہے تو میں دعا کرتا ہوں اللہ تجھ کو شفاء دے گا۔ خاتون

---

[13] [متفق علیہ]

[14] [متفق علیہ]

[15] [متفق علیہ]

نے کہا کہ میں صبر کرتی ہوں لیکن میں بے پردہ ہو جاتی ہوں، دعا کیجیے کہ ایسا نہ ہو۔ تو آپ نے اس کے لئے دعا فرمادی۔[16]

اسی طرح حضرت جابر کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ بخار آپ ﷺ کے پاس آیا اور اجازت چاہی، آپ نے پوچھا کون ہے تو اس نے کہا [ام ملدم] یعنی بخار۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اہل قباء کی طرف چلے جاؤ۔ اہل قباء کو اس سے جو تکلیف پہنچی وہ اللہ ہی جانتا ہے چنانچہ وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس بخار کی شکایت کی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر چاہو تو میں دعا کرتا ہوں تو یہ تم سے ہٹ جائے گا اور اگر چاہو تو صبر کرو یہ تمہارے لئے بخشش کا سبب بنے گا۔ تو انہوں نے کہا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ کیا آپ ایسا کر سکتے ہیں آپ ﷺ نے فرمایا ہاں۔ انہوں نے کہا تو اسے چھوڑ دیجیے۔[17]

اور کبھی کسی غیر شرعی امر کی وجہ سے سائل کی درخواست بالکل قبول نہ فرماتے۔ جیسا کہ حضرت خباب کے قصے میں یا جیسے عبد اللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے سیدہ ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کا قصہ بیان کیا ہے۔

حضرت عبداللہ سے روایت ہے کہ زوجہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ام حبیبہ رضی اللہ تعالی عنہا نے کہا' اے اللہ مجھے اپنے خاوند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور والد ابوسفیان اور بھائی معاویہ رضی اللہ عنہما سے متمتع فرما(یعنی ان تینوں کی وفات میری زندگی میں نہ ہو، مترجم) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تو نے اللہ سے مقرر شدہ اوقات و ایام اور تقسیم شدہ رزق کا سوال کیا ہے۔ ان میں سے کسی چیز کو وقت مقرر سے مقدم اور مؤخر نہیں کیا جاتا اور اگر تو اللہ سے سوال کرتی کہ وہ تجھے جہنم کے عذاب یا قبر کے عذاب سے پناہ دے تو وہ بہتر اور افضل ہوتا۔

---

[16] [متفق علیہ]

[17] [مسند احمد، مسند ابو یعلیٰ، صحیح ابن حبان]

راوي نے کہا آپ صلي الله عليه وسلم کے پاس بندروں اور خنزیروں کا ذکر کیا گیا، تو آپ نے فرمایا اللہ نے کسی مسخ شدہ قوم کی نسل نہیں چلائی اور تحقیق بندر اور سور پہلے سے ہی موجود تھے۔[18]

جس طرح آپ نے حضرت خباب کے لئے دعا نہیں فرمائی اسی طرح اپنے مرض میں بھی اپنے لئے دعا نہیں فرمائی۔

حضرت فاطمہ بنت یمان رضی اللہ عنہا (حذیفہ رضی اللہ عنہ کی بہن)فرماتی ہیں کہ ہم چند عورتیں نبی کریم ﷺ کی عیادت کے لیے حاضر ہوئیں۔ہم نے دیکھا کہ آپ ﷺ پر بخار کی شدت کی وجہ گیلا کپڑا رکھا ہوا تھا،میں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول ﷺ آپ اپنی بیماری کی شفا کے لیے اللہ سے دعا کیوں نہیں فرماتے؟تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا:ان من اشد الناس بلاءً الانبیاء ،ثم الذین یلونہم،[19] یعنی سب سے تکالیف انبیاء پر آتی ہیں اور پھر ان لوگوں پر جو ان سے (ایمان میں)ان سے قریب تر ہوتے ہیں۔

بشیر ابن خصاصیہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا: کہ 'اللہ کی حمد و ثنا کر جو تجھے ربیعۃ القشعم (قبیلے کا نام ہے)سے لایا ہے اور تو نے اللہ کے رسول کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا ہے۔بشیر بن خصاصیہؓ کہتے ہی کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول دعا کیجیے کہ اللہ مجھے آپ سے پہلے وفات دے، آپ ﷺ نے فرمایا: میں کسی کے لیے یہ دعا نہیں کرتا۔[20]

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ دعا اگرچہ اصلاً مشروع اور جائز ہے لیکن اگر کسی غیر شرعی یا بے فائدہ یا اللہ کو ناراض کرنے والی کسی چیز کی دعا مانگی جائے تو وہ جائز نہیں،اسی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے اپنے مرض میں خود اپنے لئے دعا نہیں مانگی کیونکہ انبیاء کے ساتھ اللہ کی سنت جاری ہے کہ انہیں بیماری میں شدید تکلیف ہوتی

---

[18] [صحیح مسلم]

[19] [سنن نسائی الکبریٰ]

[20] [معرفۃ الصحابہ:ابونُعیم اصبہانی]

ہے اور خباب کے لئے بھی اسی لئے دعا نہیں فرمائی کہ اہل ایمان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی سنت یہی ہے۔ اس سے یہ مسئلہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انسان اللہ سے آزمائش ختم ہونے کی دعا کر سکتا ہے لیکن اس میں حد سے زیادہ تجاوز اور جزع فزع سے کام نہیں لینا چاہیئے۔ اور نہ ہی ابتلاء کے وقت سے پہلے ختم ہونے کی دعا کرنی چاہیئے۔

یہ ابتلاء اہل ایمان کے لئے رحمت ہے اور کفار اور منافقین کے لئے اللہ کی طرف سے ایک تدبیر (چال) ہے کیونکہ اہل ایمان کو ابتلاء میں دیکھ کر کفار اور اہل ضلالت شک میں مبتلاء ہو جاتے ہیں کہ اگر یہ حق پر ہوتے تو ان پر یہ مشکلات نہ آتیں اور اہل ایمان پر ابتلاء کے ذریعے منافقین کا نفاق ظاہر ہو جاتا ہے کیونکہ ایمان کے دعوے کے باوجود ان پر کوئی ابتلاء نہیں ہوتی۔ جب کہ دوسری طرف یہ ابتلاء اہل ایمان کے لئے سراپا رحمت ہے کہ اس سے ایسے درجات بلند ہوتے ہیں اور انسان ایسے مرتبے پالیتا ہے کہ بغیر ابتلاء کے اس درجے تک نہیں پہنچ سکتا۔ اور اس ابتلاء پر صبر کفار کی شوکت و سطوت کی تباہی اور اللہ کی نصرت کا سبب بنتا ہے۔ سورت عنکبوت میں یہ بات بہت واضح انداز میں بیان فرمائی گئی ہے۔ الٓمّٓ ۝ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ ۝ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ ۝ اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ اَنْ يَّسْبِقُوْنَا ۭ سَاۗءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ۝ [العنکبوت:1،2،3،4]

”الف۔ لام۔ میم۔ کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ محض اتنا کہنے پر چھوٹ جائیں گے کہ ہم ایمان لے آئے اور ان کو آزمایا نہ جائے گا؟ اور جو لوگ ان سے پہلے ہو چکے ہیں ہم نے انکو بھی آزمایا تھا (اور انکو بھی آزمائیں گے) سو اللہ ان کو ضرور معلوم کرے گا جو (اپنے ایمان میں) سچے ہیں اور ان کو بھی جو جھوٹے ہیں۔ کیا وہ لوگ جو برے کام کرتے ہیں یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے قابو سے نکل جائیں گے برا ہے جو فیصلہ کرتے ہیں۔“

یہ آیت کفار کے لئے دھمکی اور وعید ہے کہ ان کی سطوت عارضی اور خوشی وقتی ہے، کیا ہوا کہ ابھی تک انہیں کسی قسم کے آلام و مصائب کا سامنا نہیں لیکن ان کے عذاب وعقاب کا وقت آنے ہی والا ہے، اور وہ ایسا عذاب ہے کہ جس کی کوئی انتہاء نہیں۔

اس آیت سے مومنین اور کفار کی ابتلاء کا فرق بھی واضح ہے کہ اہل ایمان کی آزمائشیں ایک نہ ایک دن ختم ہو ہی جایا کرتی ہیں لیکن کفار کے عذاب و ابتلاء کی کوئی انتہاء نہیں۔

اس بات کا نہ سمجھنا یا اس کا استحضار نہ رہنا ہی انسان کو اس چکر میں ڈال دیتا ہے کہ کسی طرح ابتلاء سے نکلے اگر تاریخ ایمانی کا تسلسل نظروں کے سامنے ہو تو انسان کبھی بھی بلندی اور رفعت کے اس ابتلاء والے راستے کو چھوڑ کر آسانی کی راہیں تلاش نہ کرے۔

رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہ کو دو عظیم سبق پڑھائے۔

- ایک تو یہ کہ انہیں سابقہ امتوں کی مثال دی۔
- اور دوسرا ایمان سے جڑی اللہ کی ابدی سنت یاد دلائی اور پھر آخر میں نصرت اور انجام کار کی خبر دی کہ جس کا کوئی ٹالنے والا نہیں جو آکر ہی رہے گا لیکن اس کا ایک وقت مقرر ہے۔

پس ایمان کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے فطری مراحل سے گزرے تاکہ اللہ کی نصرت اور اللہ کے وعدے کا وقت آن پہنچے۔

یہاں غور طلب بات یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہ کو جو مثال پیش کی وہ فداکاری، قربانی اور صرف ثابت قدمی کی مثال ہے جس میں فتح اور غلبے کا کوئی ذکر تک نہیں! بلکہ یہاں مقصود صرف اور صرف ثابت قدمی ہے! ایمان پر موت تک ثابت قدمی!

یہ صرف اس دین کی خاصیت اور امتیازی شان ہے کہ اس دین کو اختیار کرنے والے کسی دنیاوی غرض حتی کہ دشمن پر غلبے کی خاطر بھی اس دین کو اختیار نہیں کرتے بلکہ محض اس لئے کہ ان کا رب ان سے راضی ہو جائے۔ ایمان پر انہیں موت مل جائے اور جنتوں کا حصول یقینی ہو جائے۔

یہ ہے ایمان کی شان۔ اور دوسرے باطل دینوں اور دین اسلام میں فرق کا واضح نکتہ۔ یہ دین اپنی ذات میں حق ہے، سچ ہے، اور بتاتا ہے کہ انسانی وجود کا مقصد محض اللہ کی وحدانیت کا اقرار اس کی عبادت اس کی رضا طلبی اور جنت ہے بس۔ یہ ہے ایمان کی تاریخ اور یہی اس کی صحیح ترین مثال ہے۔ باقی دنیا میں فتح و نصرت اور

دشمن پر غلبے کا ملنا یہ بندوں پر اللہ کی خاص رحمت ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی فتنے میں پڑ جائے اور دین ہی چھوڑ بیٹھے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَوْلَآ اَنْ يَّكُوْنَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً لَّجَعَلْنَا لِمَنْ يَّكْفُرُ بِالرَّحْمٰنِ لِبُيُوْتِهِمْ سُقُفًا مِّنْ فِضَّةٍ وَّمَعَارِجَ عَلَيْهَا يَظْهَرُوْنَ ۝ وَلِبُيُوْتِهِمْ اَبْوَابًا وَّسُرُرًا عَلَيْهَا يَتَّكِـُٔوْنَ ۝ وَزُخْرُفًا ۭ وَاِنْ كُلُّ ذٰلِكَ لَمَّا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۭ وَالْاٰخِرَةُ عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝ [الزخرف:35،34،33]

"اور اگر یہ خیال نہ ہوتا کہ سب لوگ ایک ہی جماعت ہو جائیں تو جو لوگ اللہ کا انکار کرتے ہیں ہم ان کے گھروں کی چھتیں چاندی کی بنا دیتے اور سیڑھیاں (بھی) جن پر وہ چڑھتے ہیں۔ اور ان کے گھروں کے دروازے بھی اور تخت بھی جن پر تکیہ لگاتے ہیں۔ اور سونے کے بھی (کر دیتے) اور یہ سب کچھ دنیا کی زندگی کا سامان ہے اور آخرت آپ کے رب کے ہاں پرہیزگاروں کے لیے ہے۔"

پس ابتلاء و آزمائش یہ ایمان کے ساتھ منتھی ہے، اور بندے کی حقیقی نصرت موت تک ایمان پر ثابت قدمی ہے۔ اسی وجہ سے بعض معاصر مصنفین غلطی کرتے ہیں جیسے مثلاً ابو الاعلیٰ مودودی کہتے ہیں کہ "بعض انبیاء کے لئے کامل نصرت نہیں اتری"۔ کیونکہ یہ لوگ نصرت کا مطلب صرف دشمنوں پر دنیاوی غلبہ ہی سمجھتے ہیں حالانکہ یہ غلط ہے اور قرآن کے منہج اور حکمت کے خلاف ہے۔ قرآن کہتا ہے
اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ ۝

"حقیقت یہ ہے کہ ہم اپنے پیغمبروں اور ایمان لانے والوں کی مدد دنیوی زندگی میں بھی کرتے ہیں اور اس دن بھی (کریں گے) جب گواہ کھڑے ہوں گے۔"

بعض انبیاء قتل کر دیے گئے اور سب کے سب کو اپنے گھر بار چھوڑ کر ہجرت کرنا پڑی تو ان کی نصرت کا مطلب ہے ان کا ثابت قدم رہنا۔ باوجودیکہ ان کا دشمن طاقت و قوت میں ان سے کہیں زیادہ تھا، ظالم و جابر

تھا، لیکن وہ انہیں حق سے روکنے پر قادر نہ ہو سکا اور یہ دشمن کی ہزیمت ہی تو ہے، یہ ہے سب سے بڑی نصرت جو قرآن ہمیں بتاتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے خباب رضی اللہ عنہ کو جو پہلے لوگوں کا صبر یاد دلایا اور بتایا کہ کس طرح انہوں نے سختیاں جھیلتے ہوئے موت کو گلے لگالیا لیکن اپنے دین پر جمے رہے۔ تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ سابقہ انبیاء کے متبعین ہمارے صحابہ سے بہتر تھے اور نہ ہی ان کا مرتبہ نبی مصطفیٰ ﷺ کے صحابہ سے زیادہ ہے، کیونکہ آپ کی امت خیر الامم ہے اور آپ کی امت کے اصحاب کے خیر بقیہ امتوں کے اصحاب خیر سے افضل و مکرم ہیں۔

ایسے ہی قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو سابقہ انبیاء کی اقتداء کا جو حکم فرمایا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ انبیاء ہمارے نبی کریم ﷺ سے افضل ہیں۔ بلکہ یہ تو ایک تاریخی امر ہے کہ بعد والے پہلوں کی اقتداء کیا ہی کرتے ہیں۔ جبکہ کہ کبھی بعد والے ایسا درجہ پا لیتے ہیں کہ پہلے لوگ اس تک نہیں پہنچ سکے ہوتے اس کی مثال علم کی سی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: رُبَّ حَامِلِ فِقْهٍ لَيْسَ بِفَقِيهٍ وَرُبَّ حَامِلِ فِقْهٍ إِلَى مَنْ هُوَ أَفْقَهُ مِنْهُ۔۔۔[21]

'بہت سے لوگ جو علم اٹھائے ہوتے ہیں خود فقیہ اور سمجھدار نہیں ہوتے لیکن ایسے لوگوں تک بات پہنچا دیتے ہیں جو ان سے زیادہ فقیہ اور سمجھ دار ہوتے ہیں۔'

آپ ﷺ کے صحابہ کو دیگر انبیاء کے اتباع و اصحاب پر جو فضیلت حاصل ہے اس کے کئی اسباب ہیں بعض ذاتی اور بعض متعدی۔ ذاتی یعنی اصحاب نبی کا ذاتی خیر اور ان کے دلوں میں ایمان کا اعلیٰ درجے پر ہونا اور متعدی سبب جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے بتایا کہ آپ کے صحابہ کے ایمان پر صبر و ثبات کی وجہ سے تمام عالم کے لئے امن و امان ہے۔ اس حدیث سے اصحاب نبی کی فضیلت واضح ہے کیونکہ سابقہ امتوں کے صابرین

---

[21] [مسند احمد]

اور صالحین کی خیر اور عند اللہ مقبولیت ذاتی تھی متعدی نہیں۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک حدیث میں تمام جزیرۃ العرب کے لئے صحابہ کے صبر وثبات کی وجہ سے امن وامان کی بشارت دی تھی۔

دراصل اس فضیلت کے اختلاف کا سبب فریقین کے مقام صبر کا مختلف ہونا ہے۔ کیونکہ ایک عابد جو کہیں گوشے میں بیٹھا ہو، اگر اس کو اس کے دین سے متعلق کوئی آزمائش لاحق ہوتی ہے اور وہ ثابت قدمی دکھاتا ہے تو اس کی بڑی فضیلت ہے لیکن ایک داعی اور مجاہد کے اپنے دعوت اور جہاد پر صبر کا جو درجہ اور فضیلت ہے وہ اس سے کہیں زیادہ ہے۔ صحابہ کا یہی حال تھا۔ کیونکہ قریش انہیں ایمان قبول کرنے اور کفر چھوڑنے پر بھی ایذا پہنچاتے تھے لیکن زیادہ سختیاں صحابہ کے 'جہاد بالقران' کے ذریعے، قریش، ان کے دین اور عقائد کی مخالفت کی وجہ سے ہوتی تھی۔ صحابہ کے صبر وثبات کا درجہ انتہائی بلند تھا یہاں تک کہ بعض آگ میں جلائے گئے اور بعض قتل کر دیے گئے۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ انسان ایمان کی حقیقت اس کے بغیر پا ہی نہیں سکتا۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

ثَلَاثٌ مَنْ كُنَّ فِيهِ وَجَدَ حَلَاوَةَ الْإِيمَانِ مَنْ كَانَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِمَّا سِوَاهُمَا وَأَنْ يُحِبَّ الْعَبْدَ لَا يُحِبُّهُ إِلَّا لِلَّهِ عَزَّوَجَلَّ وَأَنْ يُقْذَفَ فِي النَّارِ أَحَبُّ إِلَيْهِ مِنْ أَنْ يُعَادَ فِي الْكُفْرِ[22]

"فرمایا یہ تین باتیں جس کسی میں ہونگیں، وہ ایمان کی مٹھاس (حلاوت) پائے گا،

1. اللہ اور اس کے رسول اس کے نزدیک تمام ماسوا سے زیادہ محبوب ہوں۔
2. جس کسی سے محبت کرے تو صرف اللہ ہی کے لئے کرے۔
3. کفر میں واپس جانے کو ایسا برا سمجھے جیسے آگ میں ڈالے جانے کو۔"

بلاشک وشبہ! صحابہ کرام اس عظیم مرتبے پر فائز تھے صفحہ ہستی پر انبیاء کے بعد مکہ میں آپ ﷺ پر ایمان لانے والے صحابہ سے زیادہ بلند درجہ کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ رضی اللہ عنہم اجمعین۔۔۔

---

[22] [صحیح بخاری]

آپ ﷺ نے حضرت خباب رضی اللہ عنہ کو جو یہ فرمایا کہ 'اللہ کی قسم دین ضرور پورا ہو کر رہے گا یہاں تک کہ صنعاء سے حضر موت کو سوار چلے گا تو اسے اللہ کے سوا کسی کا ڈر نہ ہو گا۔' یہ بشارت دراصل صحابہ کی آنے والے وقت کے لئے تربیت تھی جس کا انہیں خیال تک نہ تھا۔ کیونکہ جزیرۃ العرب بالخصوص مکہ و مدینہ اور طائف کے علاوہ باقی تمام علاقہ شر و فساد اور ڈاکہ زنی میں مشہور تھا چنانچہ جب حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ نے یہ حدیث سنی تو فرمایا کہ وادی طے کے ڈاکوؤں کا کیا بنے گا۔[23]

آپ ﷺ کی زبان مبارک سے یہ پیش گوئی سن کر صحابہ کے ایمان میں تشویش پیدا نہیں ہوئی کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ بلکہ ایمان میں اور اضافہ ہو گیا کہ اس قدر امن و امان اور فساد کا قلع قمع ہو گا۔

آپ ﷺ دین کا جو منشور لے کر آئے تھے وہ محض عقائد کی حد تک محدود نہ تھا بلکہ انسانی زندگی کے اقتصادی اور اجتماعی تمام پہلوؤں پر محیط تھا۔ عقائد کی تطہیر کی طرح ظلم و فساد کے خلاف جنگ اور جہاد بھی اس کا نصب العین تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ مکہ میں بالکل ابتداء اسلام میں صحابہ جو توحید سیکھتے تھے اس کا بہت وسیع مفہوم تھا۔ اس لئے کہ امن و امان کا یہ مرتبہ اس وقت تک حاصل ہو ہی نہیں سکتا جب تک کہ شر و فساد کی ہر ہر بنیاد کو جڑ سے اکھاڑ کر نا پھینکا جائے۔

آج کل بعض مجرمین جو یہ کہتے ہیں کہ 'دین کے مفہوم میں بتدریج ترقی ہوئی ہے کامیابی اور حالات کے تناسب سے، یا یہ کہ 'حکومت و خلافت کا تصور ایک تاریخی معاملہ ہے۔' یہ جھوٹ ہے! بہتان ہے! گمراہ کن خیال ہے! ابتداءِ دعوت ہی میں آپ ﷺ نے قریش سے یہ وعدہ فرمایا کہ ایمان لے آؤ عرب تمہارے مطیع و فرمابردار ہو جائیں گے۔ عجم تمہیں جزیہ دیں گے۔[24] کیا اس وعدے کا تصور بغیر حکومت و جہاد کے ممکن ہے؟ پس امت کی ذمہ داری ہے جو اللہ نے اس پر عائد کی ہے کہ دنیا کو اس دین کے عطا کردہ یقینی امن

---

[23] طے صنعاء اور حضر موت کے درمیان ایک جگہ ہے جہاں کے ڈاکو مشہور تھے۔

[24] [سنن الکبریٰ بیہقی، سنن نسائی الکبریٰ]

وامان سے روشناس کرائیں۔ اس دین کا مغلوب ہوناہی دنیا میں شر وفساد کا سبب ہے۔ یہ امان، اس دین کا تمام ادیان پر غلبہ، اور فساد کا خاتمہ اس دین کی تکمیل کی نشانی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے احکاماً و تشریفاً اس دین کی تکمیل فرما دی ہے۔ اللہ تعالی کا ارشاد ہے: اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ۔[المائدہ:3]

"آج کے دن ہم نے تمہارے دین کو تمہارے لئے کامل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر پوری کر دی۔ اور تمہارے لئے اسلام کو (بطور) دین پسند فرمایا۔"

قرآن کریم میں ہدایت اور نصرت کے درمیان ایک لازمی رشتہ بیان کیا گیا ہے۔

يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَيَاْبَى اللّٰهُ اِلَّآ اَنْ يُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۙ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ [التوبه:32،33]

"یہ لوگ چاہتے ہیں کہ اللہ کی روشنی کو اپنی پھونکوں سے بجھا دیں۔ مگر اللہ اپنی روشنی پوری کئے بغیر رہنے والا نہیں گو کافروں کو ناگوار (ہی کیوں نہ) لگے۔ وہ (اللہ) ہی (تو) ہے جس نے اپنے رسول (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا تاکہ اسے تمام دینوں پر غالب کر دے گو مشرکوں کو ناگوار (ہی کیوں نہ) لگے۔"

اسی وجہ سے حق کے مقابل ایسے دشمن کا ہونا ضروری ہے جو اس کی مخالفت کرے، اس کے آڑے آئے۔ اس نور کو بجھانے کی سر توڑ کوشش کرے۔ لیکن اس دشمنی اور مخالفت کے انجام کار غلبہ اور نصرت اس دین ہی کے لئے ہے۔ پہلی آیت میں یہ بیان فرمایا کہ یہ دین ضرور پورا ہو گا۔ اور دوسری آیت میں اس اتمام کی صورت بتلادی کہ باقی ادیان پر غلبے کے ذریعے پورا ہو گا۔

لیکن غلبہ و نصرت کا مفہوم یاد رکھنا از حد ضروری ہے جیسا کہ بارہا گزر چکا کہ اہل ایمان کا اپنے ایمان پر ثابت قدم رہنا ہی سب سے بڑی نصرت اور غلبہ ہے۔

وَلَا تَهِنُوۡا وَلَا تَحۡزَنُوۡا وَاَنۡتُمُ الۡاَعۡلَوۡنَ اِنۡ كُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ ۝[ال عمران:139]

”اور (دیکھو) بے دل نہ ہونا اور نہ کسی طرح غم کرنا اگر تم مومن (صادق) ہو تو تم ہی غالب رہو گے“

ضمیمہ

یہاں ایک حل طلب مسئلہ یہ بھی ہے کہ نبی کریم ﷺ جو صحابہ پر حد درجہ شفیق و مہربان تھے، اپنے صحابہ کی اِن تکالیف میں اُن کے لیے کیا کرتے تھے؟ یقیناً آپ ﷺ اپنے اصحاب کو ان تکالیف میں دیکھ کر بہت غمگین رہتے تھے، لیکن آپ ﷺ کے پاس اس وقت ان سے یہ تکالیف دور کرنے کی طاقت و قدرت نہ تھی۔ چنانچہ اسی بنا پر کسی عقل مند انسان کے لیے جو ایمان کی حقیقت سے بخوبی واقف ہو یہ بات کہنا بالکل جائز نہیں، جیسا کہ بعض جاہل لوگ دعوت و جہاد کے قائدین پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ انہوں نے مسلمان نوجوانوں کو سختیوں، مشکلات اور موت کے منہ میں دھکیل دیا ہے! ان پر آنے والے مصائب کا اصل سبب یہی ہیں! آج یہ گمراہ لوگ ان مساکین سے کوسوں دور عیش و عشرت کے حالات رہتے ہوئے زیادہ شدت سے یہ راگ الاپنے میں مصروف ہیں۔

کیونکہ عمار، یاسر اور خباب رضی اللہ عنہم وغیرہ کو پہنچنے والی جسمانی تکالیف رسول اللہ ﷺ کو پہنچنے والی تکالیف سے زیادہ تھیں، اس لیے آج بعضے، کفر اور ضلالت و جہالت کے سرچشمے آپ ﷺ پر بھی یہ تہمت لگانے سے نہیں چوکتے کہ 'خود آپ ﷺ کو تو اپنے چچا کی وجہ سے اور خاندانی اثر و رسوخ کی بنا پر اچھا خاصہ سہارہ تھا لیکن کمزور و نادار لوگوں کو یوں ہی بے یار و مددگار چھوڑ دیتے تھے (معاذ اللہ)

جبکہ حقیقت یہ ہے اس سب کے عوض آپ ﷺ نے ہر طرح کی خیر اور رحمت و نعمت سے اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کو مالا مال کر دیا تھا۔ کیونکہ ایمان کی نعمت کے بدلے اُن کے لیے ہر طرح کا عذاب جھیلنا آسان تھا۔ نیز جو تکالیف اور مصائب ان پر آئے وہ ان کے مقدر لکھے ہوئے تھے، جس کا انہیں روزِ قیامت پورا پورا اجر ملے گا۔

اب سنئے! کہ رسول اللہ ﷺ ان تکالیف کے عوض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو کیا پیش کرتے تھے۔ جو ان کے کافی وشافی تھا۔

- آپ ﷺ انہیں جنتوں کی بشارت دیتے! حضرت یاسر رضی اللہ عنہ اوران تمام گھر والوں کو آپ ﷺ نے فرمایا:'ابشروا آل یاسر موعدکم الجنة'[25](خوش خبری ہو!اے آلِ یاسر!تم سے جنت کا وعدہ ہے)اور حضرت خباب رضی اللہ عنہ کی روایت کردہ ایک حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ ان کے لیے صبر کی دعا فرمایا کرتے۔
- کبھی آپ ﷺ انہیں گناہوں کی بخشش کا پروانہ سناتے! جیسا کہ پہلے حضرت عمار رضی اللہ عنہ والی حدیث میں گذر چکا۔[26]
- سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو اللہ تعالی نے جو مال وقدرت عطا فرمائی تھی وہ اس کے ذریعے مسلمان غلاموں کو کفار سے خرید کر آزاد کرتے تھے۔ عروہ بن زبیر اپنے والد سے روایت کرتے ہیں فرماتے ہیں کہ ' ایک مرتبہ ورقہ بن نوفل بلال رضی اللہ عنہ کے پاس سے گذرے ،اس وقت ان پر تشدد کیا جارہا تھا اوروہ اَحد ،اَحد پکار رہے تھے۔تو ورقہ نے بھی کہا ' اَحد ،اَحد' اللہ یا بلال! پھر ورقہ بن نوفل امیہ بن خلف کے پاس سے گذرے ،وہ بلال رضی اللہ عنہ پر تشدد کررہا تھا۔ورقہ نے کہا 'اللہ کی قسم اگر تم نے اسے یہی بات کہنے پر قتل کر دیا تو میں اسے اپنا محبوب بنالوں گا' پھر ایک مرتبہ سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ وہاں سے گذرے تو وہ (امیہ)بلال رضی اللہ عنہ سے یہی سلوک کر رہا تھا،حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا اے امیہ!کیا تو اس مسکین کے معاملے میں اللہ سے نہیں ڈرتا، آخر کب تک یوہی چلتا رہے گا؟تو اس نے کہا کہ تم ہی نے اسے خراب کیا ہے۔جس چیز کے

[25] [رواہ الطبرانی۔الحاکم،البیہقی]

[26] دیکھیے صفحہ ۲۰

بدلے مناسب سمجھو اس چھڑالو! تو ابو بکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا! ٹھیک ہے میرے پاس اس سے زیادہ طاقت ور اور تندرست حبشی غلام ہے اور تیرے ہی دین پر ہے اس کے بدلے یہ مجھے دے دے! امیہ نے کہا مجھے قبول ہے! تو سیدنا صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو اس سے لیکر آزاد کر دیا۔ اسی طرح ہجرت سے قبل حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے سات مسلمان غلام خرید کر آزاد کرائے۔ بلال رضی اللہ عنہ ان میں سے ساتویں تھے۔"[27]

- کبھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انہیں آنے والی فتح اور نصرت کی بشارت دیتے! جیسا کہ اسی حدیث خباب رضی اللہ عنہ میں مذکور ہے۔

یہ ہیں نفسیاتی قوت کے وہ بنیادی عوامل جن کی وجہ سے ایک مؤمن اس گھاٹی کو عبور کرنے کے قابل ہوتا ہے، اور انہیں کے سبب اسے اس راہ میں صبر و ثبات ملتا ہے، اور پھر واقعتاً وہ امامت کا حقدار ٹھہرتا ہے۔ کیونکہ امامت بغیر ابتلاء کے حاصل نہیں ہو سکتی۔

استعجال (جلد بازی) ان مظبوط نفسیاتی عوامل کی دشمن ہے! کیونکہ طویل مسافت کا احساس صبر اور یقین دونوں کے لیے نقصان دہ ہے۔ استعجال کا مطلب ہے کسی چیز کو اس کے وقت سے پہلے طلب کرنا۔ بالعموم اس کے دو ہی مطلب ہیں:

- ایک تو یہ کہ کسی چیز کا وقت عند اللہ مقرر ہے، اسے اس کے وقت سے پہلے طلب کرنا۔ یہ ممنوع ہے۔ اور فساد عقل کی علامت ہے! اسی کے لیے یہ محاورہ بولا جاتا ہے: '**من استعجل قبل اوانه عوقب بحرمانه**' یعنی جس نے کسی چیز کو اس کے وقت سے قبل طلب کیا، تو وہ اس سے محروم ہی رہا! جیسے کوئی بچہ وقت مقرر سے پہلے طلب کرے، تو معذور وا پاہج ہی ہو گا۔ اس طرح پھل اپنے مقرر ہو وقت سے پہلے کسی کام کا نہیں۔

---

[27] [(حلیۃ الاولیاء وطبقات الاصفیاء ابو نُعیم)۔ (نسائی): یہ حدیث مرسل ہے۔ علامہ ابن حجرؒ نے 'الاصابۃ' میں اسے مرسل جید کہا ہے۔]

دوسرا مطلب یہ ہے کہ جہاں جلدی اور عمدگی دونوں چیزوں کا حصول ممکن ہو۔جیسے مسافر کی جلدی جو اپنا کام بھی پورے اتقان سے کر سکتا ہو، یا کوئی شخص بھی اپنے کسی مقصد یا حاجت میں جلدی کرے۔تو اس صورت میں انسان کی حالت کا اعتبار ہو گا، کہ انسان اپنی وسعت میں رہتے ہوئے، اپنے بدن یا اپنے کام کے لیے جس آلہ اور ذریعے کو بروئے کار لارہا ہے اس پر نرمی اور حقوق کی رعایت کیساتھ اگر یہ مقصد (استعجال ،جلدی) حاصل ہو سکتا تو یہاں استعجال ممنوع نہیں۔جیسا نبی کریم ﷺ کی ہدایت ہے :عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ عَنْ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ السَّفَرُ قِطْعَةٌ مِنْ الْعَذَابِ يَمْنَعُ أَحَدَكُمْ طَعَامَهُ وَشَرَابَهُ وَنَوْمَهُ فَإِذَا قَضَى نَهْمَتَهُ فَلْيُعَجِّلْ إِلَى أَهْلِهِ[28]

"ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ سفر عذاب کا ایک ٹکڑا ہے !جو تم میں سے کسی ایک کو اس کے کھانے پینے اور نیند سے محروم کر دیتا ہے۔اس لیے جب کام پورا ہو جائے تو اسے چاہیے کہ گھر لوٹنے میں جلدی کرے۔"

نیکی کے کام کرنے ،اپنے گناہوں پر توبہ کرنے اور انسان کو لاحق جسمانی ضروریات کی تکمیل میں استعجال (جلدبازی) مطلوب امر ہے۔کیونکہ ٹال مٹول اور کام کو کل پر چھوڑنا یہ نفس کی چال ہے۔یہ ایک ایسا دروازہ جس کے ذریعے سے شیطان داخل ہوتا ہے اور انسان کو بڑی خیر سے محروم کر دیتا ہے۔

لیکن یہاں جلدی کے ساتھ رفق اور نرمی کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے ۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

فَإِنَّ الرِّفْقَ لَا يَكُونُ فِي شَيْءٍ إِلَّا زَانَهُ وَلَا يُنْزَعُ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا شَانَهُ[29]

---

[28] [صحیح بخاری]

[29] [صحیح مسلم]

”نرمی جس کام میں بھی ہو تو وہ خوب تر ہو جاتا ہے، اور جس معاملے میں نرمی نہ ہو تو وہ ضرور خراب ہوتا ہے“

پس جو تفصیل گذری ہے یہ سب کی سب حدیث کا مقصود نہیں، اسی طرح جو مقولہ پہلے لوگوں سے منقول چلا آرہا ہے کہ ’العجلة والاتقان لا يجتمعان ‘یعنی جلدی اور عمدگی دونوں ایک ساتھ کسی کام میں جمع نہی ہوسکتے۔ تو ان کا یہ قول اپنے حالات اور قدیم آلات و اسباب کے اعتبار سے اپنی جگہ درست ہے۔ لیکن آج اسباب وذرایع میں اس قدر وسعت پیدا ہو چکی ہے کہ ان دونوں کا جمع کرنا ممکن ہے۔ حاصل یہ کہ اس میں اعتبار زیرِ استعمال آلے کا ہے۔ اللہ تعالی کا ارشاد ہے: **وَتَحْمِلُ اَثْقَالَكُمْ اِلٰى بَلَدٍ لَّمْ تَكُوْنُوْا بٰلِغِيْهِ اِلَّا بِشِقِّ الْاَنْفُسِ ۭاِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ** [النحل:7]

”اور تمہارے بوجھ (بھی) اٹھا کر ایسے (دور دراز) شہروں تک لے جاتے ہیں جہاں (تم خود بھی) نہیں پہنچ سکتے تھے مگر بڑی جانکاہی کے ساتھ۔ بلاشبہ تمہارا رب بڑا ہی شفیق (اور) ہمیشہ رحم کرنے والا ہے۔“

یہ مشقت و محنت آج اسباب وذرائع میں وسعت کی وجہ سے زائل ہو چکی ہے۔ اور کام بہت آسان ہو چکے ہیں۔

رہی وہ جلد بازی، کہ جس میں فطری قواعد کی خلاف ورزی ہوتی ہے وہ ممنوع ہے۔ جیسے جانور پر اسکی طاقت سے زیادہ بوجھ لادنا، یا اس کی انتہائی رفتار سے بھی بڑھ کر اسے تیز دوڑانے کی کوشش کرنا۔ یقیناً اس کے نتیجے میں جانور ضائع ہو گا اور مقصد بھی پورا نہ ہو گا۔

اس دین سے مقصود یہ ہے کہ یہ چار دانگ عالم میں پھیل جائے، دنیا میں امن و امان اور عدل کا چرچا ہو، اور اسلام ہی دین غالب ہو۔ یہ ایسی چیز ہے جس کا اللہ نے اہل ایمان سے وعدہ فرمایا ہے۔ لیکن اس امت کے افراد ہوں یا نسلیں، یہ وعدہ ہر ایک سے مختلف ہے۔ کسی سے وعدہ ہے کہ انہیں ایمان پر موت ملے گی، اور جنتوں کا حصول یقینی ہو گا۔ اور کسی سے وعدہ فرمایا کہ اسے دنیا ہی میں اس کے دشمن پر غلبہ نصیب ہو گا، اور

یوں اس کے دل کو دنیا میں بھی ٹھنڈک ملے گی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **قُلْ هَلْ تَرَبَّصُوْنَ بِنَآ اِلَّآ اِحْدَى الْحُسْنَيَيْنِ ۭ وَنَحْنُ نَتَرَبَّصُ بِكُمْ اَنْ يُّصِيْبَكُمُ اللّٰهُ بِعَذَابٍ مِّنْ عِنْدِهٖٓ اَوْ بِاَيْدِيْنَا ڮ فَتَرَبَّصُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ مُّتَرَبِّصُوْنَ** [التوبة:52]

"کہہ دو تم ہمارے حق میں دو بھلائیوں میں سے ایک کے منتظر ہو اور ہم تمہارے حق میں اس بات کے منتظر ہیں کہ اللہ اپنے ہاں سے تم پر کوئی عذاب نازل کرے یا ہمارے ہاتھوں سے تم بھی انتظار کرو ہم بھی تمہارے ساتھ انتظار کرتے ہیں"

وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ قُتِلُوْٓا اَوْ مَاتُوْا لَيَرْزُقَنَّهُمُ اللّٰهُ رِزْقًا حَسَنًا ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ [الحج:58]

" اور (دیکھو،) جن لوگوں نے اللہ کی راہ میں ہجرت کی پھر وہ مارے گئے یا مر گئے تو اللہ ان کو (آخرت میں) ضرور اچھا رزق دے گا اور یقیناً اللہ سب رزق دینے والوں سے بہتر ہے۔"

وَلَىِٕنْ قُتِلْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوْ مُتُّمْ لَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَحْمَةٌ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ [آل عمران:157]

"اگر تم اللہ کی راہ میں مارے جاؤ یا مر جاؤ تو اللہ کی مغفرت و رحمت اس (مال و دولت) سے کہیں بہتر ہے جسے یہ لوگ جمع کر رہے ہیں"

یہ سب قرآن کریم اور سنت مبارکہ میں کیے گئے وعدے ہیں۔

نیز یہ بھی حقیقت ہے ہے کہ جب بھی اسلام کے کسی پہلو یا جہت میں کہیں کوئی کمی کمزوری واقع ہوئی تو عین اس وقت کہیں دوسری یہ جانب یہ وعدے پورے ہوتے نظر آتے ہیں!!! دیکھیئے، قسطنطنیہ جس کی فتح کا وعدہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا، سلطان محمد فاتح کے ہاتھوں ایسے وقت میں فتح ہوا جب مسلمان اندلس میں شکست کھا چکے تھے اور اندلس چھوڑ کر جا رہے تھے۔ اسی طرح صلیبی جنگیں ابھی پوری طرح ختم نہ ہوئی

تھیں، مسلمان انتشار کی حالت میں آپس کی جنگوں میں مصروف تھے، اسلام کی کمزوری کے عین اسی زمانے میں کہ جب مسلمان بادشاہ اقدامی (واجب) جہاد ترک کیے بیٹھے تھے! مشرق بعید اسلام کے حلقہ بگوش ہوا۔ بس کامیاب وہ ہے! جو صبر اور اجر کی امید کے ساتھ میدان مین جمارہا، اس یقین کے ساتھ کہ اللہ کا وعدہ آیا ہی چاہتا ہے۔ پس یا تو وہ اس وعدے کو پورا ہوتا اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گا! یا کم از کم اس کے لیے پیش خیمہ ہی ثابت ہو گا! کیا ایک مؤمن کے لیے اتنا ہی کافی نہیں؟ کہ اس کا شمار صالحین میں کیا جارہا ہو اور اللہ کے راستے میں آزمائے جانے والے اہل ہدایت ائمہ دین کی فہرست میں کھڑا ہو!

اس کا تو ہدایت پر ہونا یقینی ہو گیا۔ اگر شہداء کا ذکر ہو گا تو یہ بھی اسی زمرے میں ہو گا۔ دیکھیے! کہ واعظین و خطباء جب بھی شہادت کا تذکرہ کرتے ہیں تو سمیّہ، عمر، عثمان اور حمزہ رضی اللہ عنہم کا نام ضرور لیا جاتا ہے۔ اسی طرح پھر جب اہل ہدایت کا تذکرہ ہوتا ہے تو ہدایت و رہنمائی کے بلند و بالا پہاڑوں سے ہوتا ہوتا یہ سلسلہ سید قطب، عبد اللہ عزام، خطاب، شامل، ابو مصعب (زرقاوی) احمد فضیل [اسامہ بن لادن اور انور العولقی[30]] رحمۃ اللہ علیہم تک پہنچتا ہے۔

پھر اس باب میں چند ہی ناموں سے دنیا واقف ہوتی ہے، اور وہی نام لیتی ہے۔ باقی بہت سے ایسے ہوتے ہیں جنہیں اللہ ہی جانتا ہے۔ پس شمار کرنے والے ان کا نام چھوڑ جاتے ہیں اس لیے نہیں! کہ ان کچھ کمی تھی! بلکہ صرف اس لیے کہ یہ باب اتنا وسیع ہے کہ اس کا احاطہ ممکن نہیں! اور جس کا بھی ذکر کیا جاتا ہے صرف بطور مثال ہی کیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ یہ لوگ دلیل اور سند بن جاتے ہیں! لوگ کہتے ہیں: اللہ تعالی نے کہا، پھر کہتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں کہا، اور پھر صالحین، علماء اور شہداء کی بات نقل کی جاتی ہے۔ جس زمرے میں یہ داخل ہیں تو اس کے شرف و فضائل سے ان کا بھی حصہ ہوتا ہے۔ اس میں ہر عاقل کو دعوت ہے کہ

---

[30] [ان دو ناموں کا اضافہ ناشر 'ادارہ النور للاعلام الاسلامی' کی طرف سے ہے۔ کیونکہ شیخ کی یہ تصنیف ان دو حضرات کی شہادت سے قبل کی ہے۔]

فکر و عمل کے کسی بھی دروازے میں داخل ہونے سے قبل اچھی طرح سوچ بچار کرلے! کہ یہ زندگی انتہائی مختصر ہے! مختلف فرقوں اور مختلف مقامات کے دفاتر (رجسٹر) کھلے ہیں۔ اس کے اپنے ہی ہاتھ میں ہے کہ کس دروازے میں داخل ہوتا ہے! کن صفات کو اپناتا ہے! اور کس دفتر میں اپنانام درج کرواتا ہے! اللہ تعالی کاارشادہے: بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِهٖ بَصِیْرَةٌ [القیامة:14]

"بلکہ آدمی اپنے واسطے آپ دلیل ہے۔"

والحمدللہ رب العٰلمین